

جامعہ حقانیہ کاترجان

ساہیوال  
سرگودھا

# الحقانیہ

مجلد



ربیع الاول ۱۴۳۶ھ جنوری ۲۰۱۵ء



بانی: فقیہ العصر حضرت مولانا مفتی عبدالشکور رزمی قدس سرہ

# فہرست

3	مفتی سید عبدالقدوس ترمذی مدظلہم	یاد رفتگاں
10	حضرت مولانا منظور احمد نعمانی رحمہ اللہ تعالیٰ	درس حدیث
12	حضرت مولانا مفتی جمیل احمد تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ	ملفوظات حکیم الامت رحمہ اللہ
14	حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہید	عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم
28	مفتی سید عبدالقدوس ترمذی مدظلہم	چند یادگار واقعات
37	مفتی محمد راشد سکوی	باتیں ان کی یاد میں گی
46	ع-ن-ت	تعارف کتب
47	مولانا محمد آصف چنیوٹی	اخبار الجامعہ ..

خط و کتابت کیلئے: دفتر ماہنامہ الحقانیہ جامعہ حقانیہ ساہیوال سرگودھا

web-www.alhaqqania.org

E-mail-alhaqqania@yahoo.com

048-6786002/6786899

پبلشر: مفتی سید عبدالقدوس ترمذی پرنٹر: جناب محمد منیر صاحب فاسٹر پرنٹنگ پریس سرگودھا

کمپوزر: جناب حافظ سید عبدالغفور صاحب ترمذی

نوٹ: رسالہ کے متعلق معلومات کے لیے رابطہ نمبر: 0301-4843429

رسالہ نہ ملنے کی صورت میں رابطہ نمبر: 0301-0331-6769897



## یاد رفتگان

حضرت مولانا جمشید علی خان صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ

محرم الحرام ۱۴۳۶ھ کی دسویں شب عشاء کے بعد لاہور سے ایک عزیز نے فون پر اطلاع کی کہ حضرت مولانا جمشید علی خان صاحب ابھی ابھی لاہور ہسپتال میں انتقال فرما گئے ہیں، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

کئی دنوں سے ان کی شدید ناسازی طبع کی اطلاعات مل رہی تھیں، بالآخر وہی ہوا جو ہونا تھا، حق تعالیٰ کا صریح ارشاد گرامی: کل نفس ذائقة الموت ایک ایسی حقیقت ہے جس کا انکار ممکن ہی نہیں اور نہ ہی اس سے کسی تنفس کو مفر ہے، اللہ تعالیٰ حضرت مولانا رحمہ اللہ تعالیٰ کی مغفرت فرمائیں، ان کے درجات بلند ہوں اور ان کے تمام جسمانی روحانی پسماندگان کو صبر و اجر سے نوازیں، آمین۔

حضرت مولانا صاحب بڑے ہی خوش قسمت تھے کہ ان کی ساری زندگی درس و تدریس، وعظ و تبلیغ میں گزری، امت مسلمہ کو ان کی زندگی سے بے حد نفع ہوا اور انہوں نے اپنی حیات مستعار کا کوئی لمحہ بھی ضائع نہیں کیا۔ دراصل حضرت مرحوم کو ابتداء سے ہی ایسا ماحول ملا اور ان کی ابتدائی تربیت ہی ایسے مرکز میں ہوئی جہاں سے لاکھوں مسلمانوں نے فیض پایا اور روحانی طور پر بلند مقام پر پہنچے، اس سے میری مراد خانقاہ امدادیہ اشرفیہ تھانہ بھون ہے جہاں انہوں نے اپنے بچپن میں حضرت اقدس حکیم الامت مجدد الملت حضرت شاہ اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہ سے براہ راست تربیت حاصل کی اور انہیں خاص خدای کا شرف حاصل ہوا، اس کے بعد وہ جلال آباد حضرت مسیح الامت مولانا مسیح اللہ خان جلال آبادی قدس سرہ کی زیر تربیت تعلیم حاصل کرتے رہے، بالآخر مرکز علم و عمل دارالعلوم دیوبند

میں جا کر انہوں نے حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ اور دیگر اکابر سے فیض پایا اور طاہری علوم میں بھی تکمیل فرمائی۔ بیعت کا شرف حضرت مسیح الامت قدس سرہ سے حاصل ہوا۔

۱۹۵۲ء میں دارالعلوم ٹنڈوالہ یار سندھ میں حضرت علامہ ظفر احمد عثمانی قدس سرہ کی زیر نگرانی ایک عرصہ تک تدریس کا سنہری موقع ملا، بالآخر ۱۹۶۴ء سے مرکز تبلیغ راینیوڈ سے وابستہ ہو کر تادم آخردرس و تدریس اور وعظ و ارشاد اور دعوت و تبلیغ میں اپنی پوری زندگی لگادی۔ حق تعالیٰ آپ کی تمام خدمات کو قبول فرمائیں اور رفع درجات کا سبب بنائیں۔

احقر کے والد ماجد قدس سرہ کا بچپن چونکہ تھانہ بھون میں گزرا، جہاں آپ نے حضرت اقدس حکیم الامت تھانوی قدس سرہ کے زیر سایہ اور حضرت علامہ ظفر احمد عثمانی اور اپنے والد ماجد حضرت مفتی عبدالکریم گمٹھلوی رحمہم اللہ تعالیٰ کی زیر نگرانی تعلیم و تربیت پانے کا شرف حاصل کیا، اس لیے تھانہ بھون کے زمانہ قیام میں انہیں کئی مرتبہ اپنے والد صاحب اور علامہ ظفر احمد عثمانی رحمہم اللہ تعالیٰ کے ساتھ موضع بھیسانی بھی جانا ہوا، حضرت مولانا جمشید صاحب رحمہم اللہ تعالیٰ کا تعلق بھی اسی بھیسانی ہی سے تھا، حضرت والد صاحب کا تعلق حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب مدظلہم سے دارالعلوم دیوبند میں پڑھنے کے زمانہ میں ہوا اور ان کے ساتھ آپ کئی مرتبہ لوہاری بھی گئے ہیں، جبکہ حضرت مولانا جمشید صاحب کا تعلق حضرت مولانا دامت برکاتہم سے بہت پہلے سے تھا بلکہ مفتاح العلوم جلال آباد کے زمانہ قیام میں آپ نے حضرت مولانا دامت برکاتہم سے بعض کتابیں بھی پڑھی تھیں۔ ادھر حضرت علامہ محمد رفیق صاحب رحمہم اللہ تعالیٰ جو حضرت والد صاحب کے درجہ قرآن کریم کے ساتھی تھے وہ بھی بھیسانی کے ہی رہنے والے تھے، اس طرح ان حضرات کا آپس میں بچپن اور جوانی کے زمانہ سے ہی تعلق و تعارف تھا۔ تقسیم ہند کے بعد، بعد مسافت کی وجہ سے باہم ملاقات کی نوبت کبھی کبھی ہوتی تھی لیکن سابقہ قدیم تعلقات کا ہر ایک کو لحاظ رہتا تھا،

اس لیے جب کبھی ملاقات ہوتی دیرینہ تعلقات کی جھلک اس میں ضرور موجود ہوتی تھی۔  
احقر کو خوب یاد ہے کہ جب حضرت علامہ ظفر احمد عثمانی رحمہ اللہ تعالیٰ کی سوانح  
”تذکرۃ الظفر“ کے نام سے شائع ہوئی اور جامعہ اشرفیہ لاہور میں ملاقات کے موقع پر  
والد صاحب نے انہیں اس کا ایک نسخہ پیش فرمایا تو انہوں نے کتاب دیکھتے ہی فوراً چوم کر  
سر پر رکھ لی، حضرت مولانا مرحوم سے انہیں جو عقیدت و محبت تھی یہ اس کا اظہار تھا احقر اس  
طرز عمل سے بڑا متاثر ہوا، حضرت والد صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ پر بھی اس کا خاص اثر ہوا۔

حضرت مولانا جمشید صاحب چونکہ بڑے جید عالم اور فاضل تھے اس لیے دعوت  
و تبلیغ کے ساتھ وہ ہمیشہ درس و تدریس بھی کرتے رہے اور تقریباً انہوں نے تمام اہم کتابوں  
کی تدریس فرمائی۔ آخر میں دورہ حدیث شریف کی اہم ترین کتاب اصح الکتاب بعد کتاب  
اللہ جامع صحیح بخاری شریف بھی پڑھاتے رہے، احقر کو رائے ونڈ میں ایک مرتبہ ان کے  
حلقہ درس میں بیٹھنے کا موقع ملا، اس وقت وہ اصول فقہ کی اہم کتاب ”حسامی“ پڑھا رہے  
تھے سبق کے بعد ملاقات ہوئی چونکہ وہ احقر کے جد امجد حضرت مولانا مفتی عبدالکریم  
گمٹھلوی رحمہ اللہ تعالیٰ سے واقف تھے اور انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ احقر کے جد امجد کے امام  
الدعوة و التبلیغ حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلوی رحمہ اللہ تعالیٰ سے خاص تعلقات  
تھے اس لیے احقر کے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آئے اور بڑی دعائیں دیں۔

اسی طرح برادر مکرم حضرت مولانا سید عبدالصبور صاحب ترمذی مرحوم جب کچھ  
عرصہ کے لیے جماعت میں گئے اور کئی روز ان کا رائے ونڈ میں قیام ہوا تو حضرت نے ان کا  
بڑا خیال رکھا اور حضرت جد امجد کی نسبت سے بڑی شفقت اور پذیرائی فرمائی۔ برادر مرحوم  
ہمیشہ حضرت مولانا کے اس اخلاص بھرے طرز عمل کی تعریف فرماتے تھے۔

رائے ونڈ میں سالانہ اجتماع کے علاوہ بھی کئی مرتبہ جانا ہوا، وہاں حضرت مولانا  
جمشید صاحب کے علاوہ حضرت مولانا انعام الحسن صاحب کاندھلوی، حضرت مولانا محمد عمر

پالنپوری اور دیگر اکابر کی زیارت کا موقع بھی ملا، فقیہ وقت حضرت مفتی جمیل احمد تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے ہمراہ بھی ایک مرتبہ وہاں جانے کی سعادت حاصل ہوئی اور وہاں کے تمام بزرگوں کی زیارت کا موقع ملا، حق تعالیٰ سب پر رحم فرمائیں اور مولانا مرحوم کی خدمات کو قبول فرما کر ان کو درجات عالیہ سے سرفراز فرمائیں، آمین۔

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب سرگودھوی مرحوم

منگل کی صبح احقر مدرسہ جامعہ محمدیہ فیصل آباد جانے کی تیاری کر رہا تھا اچانک فون پر اطلاع ملی کہ مولانا محمد یعقوب صاحب ناظم مدرسہ مدینۃ العلوم سرگودھا انتقال کر گئے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔ احقر فیصل آباد کا پروگرام منسوخ کر کے فوراً سرگودھا پہنچ گیا اور تدفین تک کے تمام مراحل میں شرکت کی۔

مولانا مرحوم کافی عرصہ سے گونا گوں امراض کی لپیٹ میں تھے اور ان کا علاج بھی جاری تھا، ذیابیطس، بلڈ پریشر اور دل کے اٹیک کے مہلک مرض میں مبتلا ہونے کے باوجود وہ مسجد، مدرسہ اور گھر کی تمام ذمہ داریوں کو بخوبی نبھا رہے تھے، ان کے کاموں اور ان کی ان تھک محنت کو دیکھ کر کوئی بھی یہ محسوس نہیں کر سکتا تھا کہ وہ اس قدر بیمار ہیں، یہی سلسلہ آخری دم تک جاری رہا اور وہ بالآخر موت کی بازی میں ہار گئے اور وقت موعود پر انہوں نے جان جاں آفریں کے سپرد کر دی جس سے کسی کو مفر نہیں۔

مرحوم اصلاً علاقہ شاہ پور کے رہنے والے تھے، تعلیم کے سلسلہ میں تقریباً چالیس سال قبل وہ مقام حیات مدینۃ العلوم سرگودھا میں داخل ہوئے، تمام کتب کی تعلیم حضرت مولانا قاری جلیل الرحمن صدیقی، حضرت مولانا وفاء اللہ عثمانی رحمہما اللہ تعالیٰ اور دیگر اساتذہ کرام سے یہیں حاصل کی اور دورہ حدیث شریف جامعہ خیر المدارس ملتان میں پڑھا۔ حضرت علامہ محمد شریف کشمیری رحمہ اللہ تعالیٰ، حضرت مولانا مفتی عبدالستار رحمہ اللہ تعالیٰ اور دیگر اساتذہ کرام سے کتب حدیث پڑھ کر سند فراغ حاصل کی، دورہ تفسیر امام العارفین

حضرت مولانا عبید اللہ بہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ سے شجاع آباد میں پڑھا۔

تدریس کا آغاز انہوں نے اپنی مادر علمی مدینۃ العلوم سرگودھا سے ہی کیا، بانی ادارہ حضرت مولانا قاری جلیل الرحمن صدیقی رحمہ اللہ تعالیٰ کو ان پر خاص اعتماد تھا، اس لیے انہوں نے مدرسہ کے معاملات میں ان کو اپنا رفیق خاص بنالیا اس طرح رفتہ رفتہ وہ مدرسہ میں درس و تدریس کے علاوہ دیگر امور بھی بحسن و خوبی انجام دینے لگے، چونکہ مولانا مرحوم نہایت با اعتماد اور ثقہ و امین تھے، انہیں تمام اساتذہ کرام کا اعتماد حاصل تھا، اس لیے مولانا مدرسہ کے ساتھ گھروں کے کام بھی کرتے تھے، انہوں نے ہمیشہ یہ خدمت اپنی سعادت سمجھ کر کی اور خوب کی۔

حضرت مولانا قاری جلیل الرحمن صدیقی کی وفات کے بعد مدرسہ کی نظامت حضرت مولانا وفاء اللہ عثمانی کو اور صدارت و اہتمام حضرت والد ماجد رحمہ اللہ تعالیٰ کو دیا گیا، مولانا مرحوم نے اس وقت ان دونوں بزرگوں کی سرپرستی میں مدرسہ کے تمام کام اپنے ذمہ لیے اور انہیں بڑی مستعدی اور صلاحیت سے انجام دیا، حضرت مولانا وفاء اللہ عثمانی ان کے استاذ محترم بھی تھے اور وہ سرگودھا میں ہی قیام پذیر تھے اس لیے مولانا کو ان سے ہدایات لینے اور خدمت کرنے کا خوب موقع ملا، ان کی وفات تک انہوں نے مدرسہ اور ان کی کما حقہ خدمت کی، ان کی وفات پر نظامت مدرسہ مولانا عبدالرحیم صاحب مرحوم کو سپرد کی گئی جبکہ مولانا مرحوم نیابت کے طور پر مقرر ہوئے، اس دور میں ان کا زیادہ تر رابطہ حضرت والد گرامی رحمہ اللہ تعالیٰ سے رہا اور ان کی ہدایات کے مطابق وہ ہر طرح کی خدمت کرتے رہے، ہر معاملہ میں استشارہ کے بعد جو حکم ملتا اس پر بلا ترمیم عمل کرتے۔

انہیں بانی مدرسہ حضرت مولانا جلیل الرحمن صدیقی اور حضرت مولانا وفاء اللہ عثمانی، حضرت والد ماجد رحمہم اللہ تعالیٰ تمام بزرگوں کا مکمل اعتماد حاصل تھا اور یہ سب بزرگ ان کی خدمت کے معترف اور ان سے مکمل طور پر خوش تھے اس لیے سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ

عنہ کے ارشاد گرامی: مات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وهو عنہم راض کے بموجب مولانا عبدالرحیم صاحب مرحوم کے بعد بجا طور پر نظامت مدرسہ کے لیے ان کا انتخاب کیا گیا جس کے وہ ہر طرح سے اہل تھے۔ ان کے دور نظامت میں حضرت والد گرامی کی جگہ چونکہ احقر نا کارہ کو مدرسہ مدینۃ العلوم کا اہتمام برائے نام سپرد کر دیا گیا تھا اس لیے احقر کو انہیں بہت قریب سے دیکھنے بلکہ ان سے معاملات کرنے کا موقع ملا، وہ مدرسہ کے ہر معاملہ میں احقر سے مشورہ ضروری سمجھتے تھے، چھوٹے سے لے کر بڑے کام تک ہر مسئلہ میں رجوع کرتے انہیں اپنی رائے پر کبھی اصرار نہ ہوتا بلکہ جو کچھ احقر نے کہہ دیا اسے حرف آخر قرار دیتے، ان میں اپنے بڑوں کا ادب اور نسبتوں کا لحاظ بہت زیادہ تھا اپنے اکابر سے محبت و عقیدت بھی حد سے زیادہ تھی، اس نسبت سے وہ چھوٹوں کی بات اور رائے کو بھی بہت اہمیت دیتے تھے۔

مدرسہ میں درس و تدریس کے علاوہ انتظام و انصرام، مہمانوں کی دیکھ بھال تقریباً سب کام ان کے ذمہ تھے اس کے ساتھ مسجد الہیہ میں پانچ وقت نماز کا اہتمام اور خطابت کے علاوہ روزانہ قرآن کریم کی تعلیم کی پابندی اس کے علاوہ تھی۔ مسجد الہیہ کے بانی جناب حکیم محمود صاحب اعوان ہیں، اس مسجد میں جب وہ گئے وہ اس وقت ایک چھوٹی سی مسجد تھی اور بہت ہی نشیبی جگہ پر تھی ان کے دور میں مسجد دوبارہ تعمیر ہوئی اور حضرت والد ماجد رحمہ اللہ تعالیٰ نے سنگ بنیاد رکھا اور اس تقریب میں ان کی بڑی شاندار تقریر بھی ہوئی، یہ عجیب بات ہے کہ حضرت والد صاحب قدس سرہ کا سرگودھا شہر میں سب سے آخری جو بیان ہوا وہ اسی مسجد میں ہوا تھا، یہ خطاب لا جواب شعبان المعظم ۱۴۲۱ھ میں ہوا، مسلک و مذہب کے حوالہ سے یہ بڑا عمدہ خطاب تھا جو کیسٹ میں محفوظ ہے، مولانا مرحوم کی بڑی خواہش تھی کہ وہ نفع عام کے لیے اسے شائع کرا دیں لیکن ابھی تک اس کی نوبت نہیں آئی۔ اس کے بعد جب مسجد کی توسیع کا مرحلہ آیا تو اس موقع پر انہوں نے احقر سے سنگ بنیاد رکھوایا، پھر اس



کے اوپر دوسری منزل کی تعمیر بھی شروع کرائی اور بچوں کی تعلیم کے لیے مدرسہ بھی بنایا پہلے حضرت والد ماجد کو، ان کے بعد احقرنا کارہ کو ان دونوں کا سرپرست قرار دیا اور ہمیشہ میرے مشورہ کے مطابق عمل کرتے رہے۔ یہ امر باعث شکر ہے کہ انہوں نے اپنی اولاد کو بھی دین پڑھایا اور ان کی تربیت بھی کی اب ان کی جگہ وہ مسجد اور مدرسہ کو چلا رہے ہیں، فلله الحمد ولله الشکر۔ اللہ تعالیٰ ان کی مدد فرمائیں اور انہیں کامیاب کریں۔

مولانا مرحوم انتہائی متواضع اور سادہ وضع کے مالک تھے ہر ایک سے ان کا تعلق بے لوث تھا، سب حضرات ان کے قدردان تھے ان کے جنازہ میں ہزاروں افراد کا ہجوم ان کی عوام میں مقبولیت کی کھلی علامت ہے، ان کی غایت تواضع کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ انہیں باقاعدہ طور پر حضرات صوفیاء عظام کے چاروں سلاسل چشتیہ، سہروردیہ، قادریہ، نقشبندیہ میں اجازت بیعت حاصل تھی لیکن انہوں نے کبھی اپنے آپ کو اس منصب کا اہل نہیں سمجھا کسی کو بیعت نہیں کیا بلکہ اپنے آپ کو اور بھی مٹایا جبکہ حق تعالیٰ نے انہیں من تواضع للہ رفعہ اللہ کا مصداق بنایا جس کی جھلک نماز جنازہ سے واضح ہے، مرحوم کو حج بیت اللہ اور پھر اس کے بعد عمرہ کا بے حد شوق تھا، اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ دونوں خواہشیں پوری فرمادیں۔

ان کے جانے کے بعد مدرسہ و مسجد اور بہت سے تلامذہ کے علاوہ ان کی صلیبی اولاد کی صورت میں ان کے باقیات صالحات موجود ہیں، امید ہے کہ یہ سب ان کے لیے صدقہ جاریہ اور رفع درجات نیز دیر تک ان کے ذکر کے باقی رہنے کا سبب بنیں گے۔ آخر میں دعا ہے کہ حق تعالیٰ ان کی جملہ خدمات قبول فرمائیں اور مغفرت کاملہ فرمائیں اور درجات سے نوازیں، آمین۔ فقط

احقر عبد القدوس ترمذی غفرلہ

۲۱ صفر الخیر ۱۴۳۶ھ

حضرت مولانا منظور احمد نعمانی رحمہ اللہ تعالیٰ

## درس حدیث

مرنے کے بعد

برزخ، قیامت، آخرت۔

چند اصولی باتیں: مابعد الموت کے سلسلہ کی حدیثیں پڑھنے اور ان کے مطالب سمجھنے سے پہلے چند اصولی باتیں ذہن نشین کر لینی چاہئیں، ان باتوں کے متحضر کر لینے کے بعد ان حدیثوں کے مضامین کے متعلق وہ وساوس اور شبہات ان شاء اللہ پیدا نہ ہوں گے، جو حقیقت ناشناسی کی وجہ سے بہت سے دلوں میں اس زمانہ میں پیدا ہوتے ہیں۔

(۱) انبیاء علیہم السلام کا خاص کام (جس کے لیے وہ مبعوث ہوتے ہیں) ہمیں ان باتوں کا بتلانا ہے جن کے ہم ضرورت مند تو ہیں لیکن اپنے عقل و حواس سے بطور خود ہم ان کو نہیں جان سکتے، یعنی وہ ہماری عقل کی دسترس سے باہر ہیں۔

(۲) انبیاء علیہم السلام کے لیے یقینی علم کا ایک خاص ذریعہ جو دوسرے عام انسانوں کے پاس نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کی وحی ہے، ان کو اسی ذریعہ سے ان چیزوں کا علم ہوتا ہے جن کو ہم اپنی آنکھوں، کانوں سے اور اپنی عقل و فہم سے دریافت نہیں کر سکتے، جس طرح دور بین رکھنے والا آدمی بہت دور کی وہ چیزیں دیکھ لیتا ہے جن کو عام آدمی اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھتے۔

(۳) کسی نبی کو نبی مان لینے، اور اس پر ایمان لانے کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ ہم نے اس بات کو تسلیم کر لیا اور پورے یقین کے ساتھ اس کو مان لیا اور قبول کر لیا کہ وہ ایسی جو بات بتلاتا ہے جس کو ہم خود نہیں جانتے اور نہیں دیکھتے، وہ اللہ کی وحی سے اس کا علم حاصل کر کے ہمیں بتلاتا ہے اور وہ سب حرف بحرف صحیح ہے، اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔

(۴) انبیاء علیہم السلام کبھی کوئی ایسی بات نہیں کہتے جو عقلاً ناممکن اور محال ہو، ہاں! یہ ہو سکتا ہے کہ ہماری عقل اور ہمارے حواس بطور خود اس کو سمجھ لینے سے عاجز اور قاصر ہوں، بلکہ ایسا ہونا ضروری ہے، اگر انبیاء علیہم السلام صرف وہی باتیں بتلائیں جن کو ہم خود ہی غور و فکر سے معلوم کر سکتے ہوں تو پھر ان کی ضرورت ہی کیا ہے۔

(۵) انبیاء علیہم السلام نے مابعد الموت یعنی عالم برزخ (عالم قبر) اور عالم آخرت کے متعلق جو کچھ بتلایا ہے اس میں کوئی بات بھی ایسی نہیں ہے جو عقلاً ناممکن اور محال ہو، ہاں! ایسی چیزیں ضرور ہیں جن کو ہم اپنے غور و فکر سے از خود نہیں جان سکتے اور اس دنیا میں ان چیزوں کے نمونے نہ ہونے کی وجہ سے ہم ان کو اس طرح سمجھ بھی نہیں سکتے، جس طرح اس دنیا کی دیکھی بھالی چیزوں کو سمجھ لیتے ہیں۔

(۶) علم کے جو عام فطری ذریعے اور وسیلے ہمیں دیے گئے ہیں مثلاً: آنکھ، ناک، کان، عقل و فہم ظاہر ہے کہ ان کی طاقت اور ان کا دائرہ عمل بہت محدود ہے، اور ہم دیکھتے ہیں کہ جدید آلات کی خارجی مدد سے ان کے ذریعہ بہت سی وہ چیزیں ہمارے علم میں آ جاتی ہیں جن کا پہلے کبھی تصور بھی نہیں کیا جاتا تھا، مثلاً پانی میں یا خون میں جو جراثیم پائے جاتے ہیں اب خوردبین کی مدد سے آنکھ ان کو دیکھ لیتی ہے، ریڈیو کی مدد سے کان ہزاروں میل دور تک کی آوازیں لیتے ہیں، اسی طرح کتابی معلومات کی مدد سے پڑھے لکھے انسان کی عقل اس سے زیادہ سوچ لیتی ہے جتنا کہ آنکھ کان کے ذریعہ حاصل شدہ معلومات کی مدد سے سوچ سکتی تھی۔ اس تجربہ سے معلوم ہوا کہ کسی حقیقت کا صرف اس بنیاد پر انکار کر دینا کہ آج ہم اس کو نہیں دیکھتے، نہیں سنتے، یا ہماری عقل اس کو نہیں سمجھتی، بڑی بے عقلی کی بات ہے: وما اوتیتم من العلم الا قليلاً۔

(معارف الحدیث)

مرسلہ: بندہ محمد صدیق عفا اللہ عنہ

## ملفوظات حکیم الامت رحمہ اللہ تعالیٰ

کچھ عورتوں کے تذکرہ کے بعد فرمایا کہ ہمارے ماموں صاحب فرماتے تھے کہ دو چیزیں بہت قابل رعایت ہیں ایک عورتیں اور ایک مسجد کہ ان کی رعایت کو کوئی اپنے ذمہ نہیں سمجھتا۔

فرمایا امام غزالی رحمہ اللہ نے ایک بڑی مشکل بات لکھی ہے کہ جس کمال کے گمان پر کوئی کسی کو کچھ دے اور اس کے اندر وہ کمال نہ ہو تو لینا جائز نہیں اس لئے کہ اس میں دھوکہ دینا ہے، اس پر ایک صاحب نے شبہ کیا کہ بزرگوں کو لوگ بزرگ سمجھ کر دیتے ہیں اور بزرگ حضرات خود کو بزرگ نہیں سمجھتے تو یہ دھوکہ ہوا، جواب میں فرمایا کہ حضرت امام کا کلام مجمل ہے یہ اس شخص کیلئے ہے جو اپنے آپ کو بناوے اور دھوکہ دینے کیلئے کمال ظاہر کرے، پھر فرمایا کہ امام غزالی رحمہ اللہ ہر تحقیق میں بہت دور پہنچتے ہیں اس لئے احیاء العلوم کے معیار پر کوئی اتر جائے بہت مشکل ہے، حضرت امام کا معیار ہی بہت عالی ہے، چونکہ خود محتاط ہیں چاہتے ہیں کہ دوسروں کو بھی اسی درجہ پر پہنچا دیں مگر ہم جیسے ضعفاء وہاں کہاں پہنچ سکتے ہیں اس لئے اس وقت مشائخ کو تسہیل کی ضرورت ہے۔

فرمایا مولانا یعقوب صاحب کو ایک صاحب نے بچپن میں بھی دیکھا تھا انہوں نے مجھ سے بیان کیا کہ یہ ابتدا سے ہی عقیف اور متقی تھے اور ایک صاحب نے یہ بھی بیان کیا کہ جب غدر کی ہڑ بونگ ہوئی مولانا کی تنخواہ ڈیڑھ سو روپیہ تھی مدارس کے ڈپٹی انسپکٹر تھے تو چھ مہینہ کی تنخواہ نو سو روپیہ اکٹھی ملنے لگی مگر انکار فرمادیا کہ میں نے کام نہیں کیا حکام نے عرض بھی کیا کہ آپ کام کیلئے آمادہ تو رہے فرمایا نہیں جب کام نہیں کیا تو تنخواہ نہیں لیتا۔

فرمایا مولانا محمد یعقوب صاحب کا خیال جب دیوبند میں مکان بنانے کا ہوا تو

مولانا نے دعا فرمائی چنانچہ اتنی رقم آگئی کہ اس سے مکان بن گیا پھر خواب میں جنت دیکھی اور اس میں ایک مکان دیکھا نہایت عالی شان مگر اس کا ایک کنگرہ ٹوٹا ہوا ہے پوچھا یہ مکان کس کا ہے؟ تو کسی نے کہا محمد یعقوب کا، پھر پوچھا کہ اس کا کنگرہ ٹوٹا ہوا کیوں ہے؟ جواب ملا انہوں نے دنیا میں مانگ لیا، مولانا کا مقام ادلال یعنی ناز کا تھا عرض کیا کہ حضور اگر کنگرے توڑ توڑ دیئے جائیں گے تو ہم تو سارا مکان کھا جائیں گے آپ کے خزانہ میں کیا کمی ہے اپنے خزانہ سے ہی عطا فرمائیے، پھر معلوم نہیں کیا ہوا۔

فرمایا مولانا گنگوہی فرماتے تھے کہ حضرت حاجی صاحب کبھی کبھی دہلی تشریف لاتے تھے اور یہ مولانا کی طالب علمی کے زمانہ کا قصہ ہے مولانا اس وقت مولانا محمد یعقوب صاحب کے والد ماجد مولانا مملوک علی صاحب سے پڑھتے تھے مولانا مملوک علی صاحب درس کے بہت پابند تھے کبھی ناعد نہ فرماتے تھے مگر ایک بار حضرت حاجی صاحب تشریف لائے تو مولانا نے فرمایا لو بھائی حاجی صاحب آگئے اب سبق نہ ہوگا تو ہم کو بڑا غصہ آیا کہ یہ کہاں کے حاجی صاحب آئے کہ سبق ہی کا حرج ہو گیا اور یہ خبر نہ تھی کہ ہمیشہ ہی کا سبق چھڑا دیں گے، کیونکہ پھر درس تدریس کا وہ رنگ نہیں رہتا چھڑانے کا یہی مطلب ہے۔

ایک بزرگ تھے نازوالے، شکستہ حال، پراگندہ ایک شہر کے دروازہ پر پہنچے تو شہر پناہ بند، لوگوں سے پوچھا کہ دن میں شہر پناہ کیوں بند ہے؟ جواب ملا کہ بادشاہ کا باز چھوٹ گیا ہے اس لئے دروازے بند کر دیئے کہ کہیں نکل نہ جائے، آپ نے عرض کیا کہ حضور ایسوں کو تو سلطنت دے رکھی ہے جن میں اتنی بھی عقل نہیں، ایک ہم ہیں عقل بھی، علم بھی مگر ضروریات سے بھی تنگ، اس پر عتاب ہوا اور ارشاد ہوا کیا تم اس پر راضی ہو کہ تمہارا علم و ورع اور افلاس اس کو دے دیا جائے اور اس کی سلطنت اور بے عقلی تم کو دے دی جائے، بس کانپ اٹھے اور توبہ کی۔

حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہید

## عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم

۱۲ ربیع الاول کو آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ”جشن عید“ منایا جاتا ہے اور آج کل اسے اہل سنت کا خاص شعار سمجھا جانے لگا ہے۔ اس کے بارے میں بھی چند ضروری نکات عرض کرتا ہوں:

(۱)..... آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر خیر ایک اعلیٰ ترین عبادت بلکہ روح ایمان ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا ایک ایک واقعہ سرمہ چشم بصیرت ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صغریٰ، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا شباب، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا جہاد، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قربانی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر و فکر، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت و نماز، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اخلاق و شمائل، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت و سیرت، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا زہد و تقویٰ، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا علم و خشیت، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اٹھنا بیٹھا، چلنا پھرنا، سونا جاگنا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صلح و جنگ، خفگی و غصہ، رحمت و شفقت، تبسم و مسکراہٹ، الغرض آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ایک ادا اور ایک ایک حرکت و سکون امت کے لیے اسوۂ حسنہ اور اکسیر ہدایت ہے اور اس کا سیکھنا سکھانا، اس کا مذاکرہ کرنا، دعوت دینا امت کا فرض ہے۔ صلی اللہ علیہ وسلم

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت رکھنے والی شخصیات اور چیزوں کا تذکرہ بھی عبادت ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے احباب و اصحاب، ازواج و اولاد، خدام و عمال، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا لباس و پوشاک، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہتھیاروں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھوڑوں، خچروں اور ناقہ کا تذکرہ بھی عین عبادت ہے، کیوں کہ یہ



در اصل ان چیزوں کا تذکرہ نہیں، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت کا تذکرہ ہے۔ صلی اللہ علیہ وسلم

(۲)..... آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے دو حصے ہیں، ایک ولادت شریفہ سے لے کر قبل از نبوت تک کا اور دوسرا بعثت سے لے کر وصال شریف تک کا، پہلے حصہ کے جستہ جستہ بہت سے واقعات حدیث و سیرت کی کتابوں میں موجود ہیں اور حیات طیبہ کا دوسرا حصہ۔ جسے قرآن کریم نے امت کے لیے ”اسوہ حسنہ“ فرمایا ہے۔ اس کا مکمل ریکارڈ حدیث و سیرت کی شکل میں محفوظ ہے اور اس کو دیکھنے سے ایسا لگتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم باہمہ خوبی و زیبائی گویا ہماری آنکھوں کے سامنے چل پھر رہے ہیں، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جمالِ جہاں آراء کی ایک ایک ادا اس میں صاف جھلک رہی ہے۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

بلا مبالغہ یہ اسلام کا عظیم ترین اعجاز اور اس امت مرحومہ کی بلند ترین سعادت ہے کہ اس کے پاس ان کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا پورا ریکارڈ موجود ہے۔ اور وہ ایک ایک واقعہ کے بارے میں دلیل و ثبوت کے ساتھ نشانہ ہی کر سکتی ہے کہ یہ واقعہ کہاں تک صحیح ہے؟ اس کے برعکس آج دنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں جن کے پاس ان کے ہادی کی زندگی کا صحیح اور مستند ریکارڈ موجود ہو۔ یہ نکتہ ایک مستقل مقالے کا مضمون ہے، اس لیے یہاں صرف اسی قدر اشارے پر اکتفا کرتا ہوں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کو بیان کرنے کے دو طریقے کے ہیں۔ ایک یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کے ایک ایک نقشے کو اپنی زندگی کے ظاہر و باطن پر اس طرح آویزاں کیا جائے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر امتی کی صورت و سیرت، چال ڈھال، رفتار و گفتار، اخلاق و کردار آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا مرقع بن جائے اور دیکھنے والے کو نظر آئے کہ یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا غلام ہے۔ دوسرا

طریقہ یہ ہے کہ جہاں بھی موقع ملے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر خیر سے ہر مجلس و محفل کو معمور و معطر کیا جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل و کمالات اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بابرکت اعمال و اخلاق اور طریقوں کا تذکرہ کیا جائے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے ہر نقش قدم پر مرثیے کی کوشش کی جائے۔ سلف صالحین، صحابہ و تابعین اور ائمہ ہدیٰ ان دونوں طریقوں پر عامل تھے۔ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ایک سنت کو اپنے عمل سے زندہ کرتے تھے اور ہر محفل و مجلس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کا تذکرہ کرتے تھے۔ آپ نے سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ واقعہ سنا ہوگا کہ ان کے آخری لمحات حیات میں ایک نوجوان ان کی عیادت کے لیے آیا۔ واپس جانے لگا تو حضرت نے فرمایا: ”برخوردار! تمہاری چادر ٹخنوں سے نیچی ہے اور یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے خلاف ہے۔“ ان کے صاحبزادے سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کو اپنانے کا اس قدر شوق تھا کہ جب حج پر تشریف لے جاتے تو جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سفر حج میں پڑاؤ کیا تھا، وہاں اترتے، جس درخت کے نیچے آرام فرمایا تھا، اس درخت کے نیچے آرام کرتے۔ اور جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فطری ضرورت کے لیے اترے تھے، خواہ تقاضا نہ ہوتا تب بھی وہاں اترے اور جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھے تھے اس کی نقل اتارتے۔ رضی اللہ عنہ۔ یہی عاشقان رسول صلی اللہ علیہ وسلم تھے جن کے دم قدم سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ صرف اوراق و کتب کی زینت نہیں رہی، بلکہ جیتی جاگتی زندگی میں جلوہ گر ہوئی اور اس کی بوئے عنبرین نے مشامِ عالم کو معطر کیا۔ صحابہ کرام اور تابعین بہت سے ایسے ممالک میں پہنچے جن کی زبان نہیں جانتے تھے، نہ وہ ان کی لغت سے آشنا تھے، مگر ان کی شکل و صورت، اخلاق و کردار اور اعمال و معاملات کو دیکھ کر علاقوں کے علاقے اسلام کے حلقہٴ بگوش اور جمالِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام بے دام بن گئے۔ یہ سیرت نبوی صلی

اللہ علیہ وسلم کی کشش تھی، جس کا پیغام ہر مسلمان اپنے عمل سے دیتا تھا۔ صلی اللہ علیہ وسلم سلف صالحین نے کبھی سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جلسے نہیں کیے اور نہ میلاد کی محفلیں سجائیں، اس لیے کہ وہاں ”ہر روز روزِ عید“ اور ”ہر شب شبِ برأت“ کا قصہ تھا۔ ظاہر ہے کہ جب ان کی پوری زندگی ”سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم“ کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی، جب ان کی ہر محفل و مجلس کا موضوع ہی سیرت طیبہ تھا اور جب ان کا ہر قول و عمل سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مدرسہ تھا، تو ان کو اس نام کے جلسوں کی نوبت کب آسکتی تھی۔ لیکن جوں جوں زمانہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک دور سے بُعد ہوتا گیا، عمل کے بجائے قول کا اور کردار کے بجائے گفتار کا سکہ چلنے لگا۔ الحمد للہ! یہ امت کبھی بانجھ نہیں ہوئی۔ آج اس گئے گزرے دور میں بھی اللہ تعالیٰ کے ایسے بندے موجود ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کا آئینہ سامنے رکھ کر اپنی زندگی کے گیسو کا کل سنوارتے ہیں اور ان کے لیے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ایک سنتِ ملکِ سلیمان اور گنجِ قارون سے زیادہ قیمتی ہے۔ لیکن مجھے شرمساری کے ساتھ یہ اعتراف کرنا چاہیے کہ ایسے لوگ کم ہیں، جب کہ ہم سے اکثریت مجھ جیسے بدنام کنندہ، گپوڑوں اور نعرہ بازوں کی ہے جو سال میں ایک دو بار سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے نعرے لگا کر یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ان کے ذمہ ان کے محبوب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا جو حق تھا، وہ قرض انہوں نے پورا ادا کر دیا، اور اب ان کے لیے شفاعت واجب ہو چکی ہے۔ مگر ان کی زندگی کے کسی گوشے میں دور دور تک سیرت طیبہ کی کوئی جھلک دکھائی نہیں دیتی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک سیرت کے ایک ایک نشان کو انہوں نے اپنی زندگی کے دامن سے کھرچ کھرچ کر صاف کر ڈالا ہے، اور روزمرہ نہیں بلکہ ہر لمحہ اس کی مشق جاری رہتی ہے، مگر ان کے پتھر دل کو کبھی احساس تک نہیں ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی سنتوں اور اپنے طریقوں کے مٹنے سے کتنی تکلیف اور اذیت ہوتی ہوگی۔ وہ اس خوش فہمی میں ہیں کہ بس تواری کے دو چار نغمے سننے،

نعت شریف کے دو چار شعر پڑھنے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حق ادا ہو جاتا ہے۔  
 میلاد کی محفلوں کے وجود سے امت کی چھ صدیاں خالی گزرتی ہیں اور ان چھ  
 صدیوں میں جیسا کہ میں ابھی عرض کر چکا ہوں، مسلمانوں نے کبھی ”سیرت النبی صلی اللہ  
 علیہ وسلم“ کے نام سے کوئی جلسہ یا ”میلاد“ کے نام سے کوئی محفل نہیں سجائی۔ ”محفل میلاد“  
 کا آغاز سب سے پہلے ۶۰۴ھ میں سلطان ابوسعید مظفر اور ابوالخطاب ابن دحیہ نے کیا، جس  
 میں تین چیزیں بطور خاص ملحوظ تھیں:

(۱)..... بارہ ربیع الاول کی تاریخ کا تعین۔

(۲)..... علماء و صلحاء کا اجتماع۔

(۳)..... اور ختم محفل پر طعام کے ذریعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روح پُرفتح  
 کو ایصال ثواب۔

ان دونوں صاحبوں کے بارے میں اختلاف ہے کہ یہ کس قماش کے آدمی تھے؟  
 بعض مورخین نے ان کو فاسق و کذاب لکھا ہے اور بعض نے عادل و ثقہ۔ واللہ اعلم۔ جب یہ  
 نئی رسم نکلی تو علمائے امت کے درمیان اس کے جواز و عدم جواز کی بحث چلی، علامہ فاکھاٹی  
 اور ان کے رفقاء نے ان خود ساختہ قیود کی بناء پر اس میں شرکت سے عذر کیا اور اسے  
 ”بدعت سیئہ“ قرار دیا۔ اور دیگر علماء نے سلطان کی ہم نوائی کی۔ اور ان قیود کو مباح سمجھ کر  
 اس کے جواز و استحسان کا فتویٰ دیا۔ پھر جب ایک باریہ رسم چل نکلی تو یہ صرف ”علماء و صلحاء  
 کے اجتماع“ تک محدود نہ رہی، بلکہ عوام کے دائرے میں آ کر ان کی نئی نئی اختراعات کا تختہ  
 مشق بنتی چلی گئی۔ آج ہمارے سامنے عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جو ترقی یافتہ شکل  
 موجود ہے (اور ابھی خدا بہتر جانتا ہے کہ اس میں مزید کتنی ترقی مقدر ہے) اب ہمیں اس کا  
 جائزہ لینا ہے۔

سب سے پہلے دیکھنے کی بات تو یہ ہے کہ جو فعل صحابہ و تابعین کے زمانے میں کبھی

نہیں ہوا، بلکہ جس کے وجود سے اسلام کی چھ صدیاں خالی چلی آئی ہیں۔ آج وہ ”اسلام کا شعار“ کہلاتا ہے۔ اس شعار اسلام کو زندہ کرنے والے ”عاشقانِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم“ کہلاتے ہیں، اور جو لوگ اس نواہی و شعارِ اسلام سے نا آشنا ہوں، ان کو دشمنانِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم تصور کیا جاتا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

کاش! ان حضرات نے کبھی یہ سوچا ہوتا کہ چھ صدیوں کے جو مسلمان ان کے اس خود تراشیدہ شعارِ اسلام سے محروم رہے ہیں، ان کے بارے میں کیا کہا جائے گا؟ کیا وہ سب نعوذ باللہ! دشمنانِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم تھے؟ اور پھر انہوں نے اس بات پر کبھی غور کیا ہوتا کہ اسلام کی تکمیل کا اعلان توحۃ الوداع میں عرفہ کے دن ہو گیا تھا۔ اسکے بعد وہ کونسا پیغمبر آیا تھا جس نے ایک ایسی چیز کو ان کے لیے شعارِ اسلام بنا دیا جس سے چھ صدیوں کے مسلمان نا آشنا تھے۔ کیا اسلام میرے یا کسی کے ابا کے گھر کی چیز ہے کہ جب چاہو اس کی کچھ چیزیں حذف کر دو اور جب چاہو اس میں کچھ اور چیزوں کا اضافہ کر ڈالو؟

در اصل اسلام سے پہلے قوموں میں اور اپنے بزرگوں کے بانیانِ مذہب کی برسی منانے کا معمول ہے، جیسا کہ عیسائیوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے یوم ولادت پر ”عید میلاد“ منائی جاتی ہے۔ اس کے برعکس اسلام نے برسی منانے کی رسم کو ختم کر دیا تھا اور اس میں دو حکمتیں تھیں۔ ایک یہ کہ سالگرہ کے موقع پر جو کچھ کیا جاتا ہے وہ اسلام کی دعوت اور اس کی روح و مزاج سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔ اسلام اس ظاہری سچ دھج، نمود و نمائش اور نعرہ بازی کا قائل نہیں، وہ اس شور و شغب اور ہاؤ ہو سے ہٹ کر اپنی دعوت کا آغاز دلوں کی تبدیلی سے کرتا ہے، اور عقائدِ حقہ، اخلاقِ حسنہ اور اعمالِ صالحہ کی تربیت سے ”انسان سازی“ کا کام کرتا ہے۔ اس کی نظر میں یہ ظاہری مظاہرے ایک کوڑی کی قیمت بھی نہیں رکھتے، جن کے بارے میں کہا گیا ہے

ع جگمگاتے درود یوار، دل بے نور ہیں

دوسری حکمت یہ ہے کہ اسلام دیگر مذاہب کی طرح کسی خاص موسم میں برگ و بار نہیں لاتا، بلکہ وہ تو ایسا سدا بہار شجرہ طوبیٰ ہے جس کا پھل اور سایہ دائم و قائم ہے۔ گویا اس کے بارے میں قرآنی الفاظ میں ”اکلھا دائم و ظلھا“ کہنا بجا ہے۔ اس کی دعوت اور اس کا پیغام کسی خاص تاریخ کا مرہونِ منت نہیں بلکہ آفاق و ازمان کو محیط ہے۔

اور پھر دوسری قوموں کے پاس تو دو چار ہستیاں ہوں گی جن کی سالگرہ منا کر وہ فارغ ہو جاتی ہیں۔ اس کے برعکس اسلام کے دامن میں ہزاروں لاکھوں نہیں، بلکہ کروڑوں ایسی قد آور ہستیاں موجود ہیں جو ایک سے ایک بڑھ کر ہیں اور جن کی عظمت کے سامنے آسمان کی بلندیاں ہیچ اور نورانی فرشتوں کا تقدس گردِ راہ ہے۔ اسلام کے پاس کم و بیش سوالات کی تعداد تو ان انبیاء علیہم السلام کی ہے۔ جو انسانیت کے ہیرو ہیں اور جن میں سے ایک ایک کا وجود کائنات کی ساری چیزوں پر بھاری ہے۔ پھر انبیاء کرام علیہم السلام کے بعد صحابہ کرام کا قافلہ ہے، ان کی تعداد بھی سوالات سے کیا کم ہوگی، پھر ان کے بعد ہر صدی کے وہ لاکھوں اکابر اولیاء اللہ ہیں جو اپنے اپنے وقت میں رشد و ہدایت کے مینارِ نور تھے اور جن کے آگے بڑے بڑے جابر بادشاہوں کی گردنیں جھک جاتی تھیں۔ اب اگر اسلام شخصیتوں کی سالگرہ منانے کا دروازہ کھول دیتا تو غور کیجیے! اس امت کو سال بھر میں سالگرہوں کے علاوہ کسی اور کام کے لیے ایک لمحہ کی بھی فرصت ہوتی؟

چونکہ یہ چیز ہی اسلام کی دعوت اور اس کے مزاج کے خلاف تھی، اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ و تابعین کے بعد چھ صدیوں تک امت کا مزاج اس کو قبول نہ کر سکا۔ اگر آپ نے اسلامی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اسلامی تاریخ میں چھٹی صدی وہ زمانہ ہے، جس میں فرزندِ انِ تثلیث نے صلیبی جنگیں لڑیں، اور مسیحیت کے ناپاک اور منحوس قدموں نے عالم اسلام کو روند ڈالا۔ ادھر مسلمانوں کا اسلامی مزاج داخلی و خارجی فتنوں کی مسلسل یلغار سے کمزور پڑ گیا تھا۔ ادھر مسیحیت کا عالم اسلام پر فاتحانہ



حملہ ہوا، اور مسلمانوں میں مفتوح قوم کا سا احساس کمتری پیدا ہوا، اس لیے عیسائیوں کی تقلید میں یہ قوم بھی سال بعد اپنے مقدس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ”یوم ولادت“ کا جشن منانے لگی، یہ قوم کے کمزور اعصاب کی تسکین کا ذریعہ تھا، تاہم جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، امت کے مجموعی مزاج نے اس کو قبول نہیں کیا۔ بلکہ ساتویں صدی کے آغاز سے لے کر آج تک علمائے امت نے اسے ”بدعت“ قرار دیا اور اسے ”ہر بدعت گمراہی ہے“ کے زمرے میں شمار کیا۔

اگرچہ ”میلاد“ کی رسم ساتویں صدی کے آغاز سے شروع ہو چکی تھی اور لوگوں نے اس میں بہت سے امور کے اضافے بھی کیے، لیکن کسی کو یہ جرأت نہیں ہوئی تھی کہ اسے ”عید“ کا نام دیتا۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ ”میری قبر کو عید نہ بنانا“۔ اور میں اوپر حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی کے حوالے سے بتا چکا ہوں کہ ”عید“ بنانے کی ممانعت کیوں فرمائی گئی تھی۔ مگر اب چند سالوں سے اس سالگرہ کو ”عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم“ کہلانے کا شرف بھی حاصل ہو گیا ہے۔

دنیا کا کون مسلمان اس سے ناواقف ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے لیے ”عید“ کے دو دن مقرر کیے ہیں: عید الفطر اور عید الاضحیٰ۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یوم ولادت کو بھی ”عید“ کہنا صحیح ہوتا اور اسلام کے مزاج سے یہ چیز کوئی مناسبت رکھتی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود ہی اس کو ”عید“ قرار دے سکتے تھے، اور اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک یہ پسندیدہ چیز ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نہ سہی، خلفائے راشدین ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے یوم ولادت کو ”عید“ کہہ کر ”جشن عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم“ کی طرح ڈالتے، مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا، اس سے دوہی نتیجے نکل سکتے ہیں یا یہ کہ ہم اس کو ”عید“ کہنے میں غلطی پر ہیں یا یہ کہ نعوذ باللہ ہمیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یوم ولادت کی خوشی ہے، مگر صحابہ کرام خصوصاً خلفائے

راشدین کو کوئی خوشی نہیں تھی، انہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اتنا عشق بھی نہیں تھا جتنا ہمیں ہے۔ ستم یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ ولادت میں تو اختلاف ہے، بعض ۹/ربیع الاول بتاتے ہیں، بعض ۸/ربیع الاول، اور مشہور بارہ ربیع الاول ہے۔ لیکن اس میں کسی کا اختلاف نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات شریفہ ۱۲/ربیع الاول ہی کو ہوئی۔ گویا ہم نے ”جشن عید“ کے لیے دن بھی تجویز کیا تو وہ جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے داغِ مفارقت دے گئے، اگر کوئی ہم سے یہ سوال کرے کہ تم لوگ ”جشن عید“ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت طیبہ پر مناتے ہو یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خوشی میں؟ (نعوذ باللہ) تو شاید ہمیں اس کا جواب دینا بھی مشکل ہوگا۔

بہر حال میں اس دن کو ”عید“ کہنا معمولی بات نہیں سمجھتا، بلکہ اس کو صاف صاف تحریف فی الدین سمجھتا ہوں اس لیے کہ ”عید“ اسلامی اصطلاح ہے، اور اسلامی مطابق اصطلاحات کو اپنی خود رائی سے غیر منقول جگہوں پر استعمال کرنا دین میں تحریف ہے۔ اور پھر یہ ”عید“ جس طرح منائی جاتی ہے، وہ بھی لائقِ شرم ہے، بے ریش لڑکے غلط سلطاعتیں پڑھتے ہیں، موضوع اور من گھڑت قصے کہانیاں، جن کا حدیث و سیرت کی کسی کتاب میں کوئی وجود نہیں، بیان کی جاتی ہیں، شور و شغب ہوتا ہے۔ نمازیں غارت ہوتی ہیں، اور نامعلوم کیا کیا ہوتا ہے، کاش! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر جو ”بدعت“ ایجاد کی گئی تھی اس میں کم از کم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت و تقدس ہی کو ملحوظ رکھا جاتا۔

غضب یہ کہ سمجھا یہ جاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان خرافاتی محفلوں میں بنفس نفیس تشریف بھی لاتے ہیں۔ فی اغربة الاسلام! (ہائے اسلام کی بیچارگی!) اب میں اس ”عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم“ کا آخری کارنامہ عرض کرتا ہوں، کچھ عرصہ سے ہمارے کراچی میں ”عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم“ کے موقع پر آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ اطہر اور بیت اللہ شریف کی شبیہ بنائی جاتی ہے، اور جگہ جگہ بڑے بڑے چوکوں میں سانگ بنا کر رکھے جاتے ہیں۔ لوگ ان سے تبرک حاصل کرتے ہیں اور ”بیت اللہ“ کی خود ساختہ شبیہ کا طواف بھی کرتے ہیں اور یہ سب کچھ مسلمانوں کے ہاتھوں اور علماء کی نگرانی میں کرایا جا رہا ہے۔ فیا اسفاہ!

”جشن عید میلاد“ کی باقی ساری چیزوں کو چھوڑ کر اسی ایک منظر کا جائزہ لیجیے کہ اس میں کتنی قباحتوں کو سمیٹ کر جمع کر دیا گیا ہے۔

اول: اس پر جو ہزاروں روپیہ خرچ کیا جاتا ہے، یہ محض اسراف و تبذیر اور فضول خرچی ہے۔ آپ ملا علی قاریؒ کے حوالے سے سن چکے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں پر چراغ اور شمع جلانے والوں پر اس لیے لعنت فرمائی ہے کہ یہ فعل عبث ہے اور خدا کے دیے ہوئے مال کو مفت ضائع کرنا ہے۔ ذرا سوچیے! جو مقدس نبی صلی اللہ علیہ وسلم قبر پر ایک چراغ جلانے کو فضول خرچی کی وجہ سے ممنوع اور ایسا کرنے والوں کو ملعون قرار دیتا ہے، اس کا ارشاد اس ہزاروں لاکھوں روپے کی فضول خرچی کرنے والوں کے بارے میں کیا ہوگا؟ اور پھر یہ بھی دیکھیے کہ یہ فضول خرچی وہ غربت زدہ قوم کر رہی ہے جو روٹی، کپڑا، مکان کے نام پر ایمان تک کا سودا کرنے کو تیار ہے۔ اس فضول خرچی کے بجائے اگر یہی رقم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایصالِ ثواب کے لیے غرباء و مساکین کو چپکے سے نقد دے دی جاتی، تو نمائش تو بلاشبہ نہ ہوتی مگر اس رقم سے سینکڑوں اجڑے گھر آباد ہو سکتے تھے۔ ان سینکڑوں بچیوں کے ہاتھ پیلے کیے جاسکتے تھے جو اپنے والدین کے لیے سوہان روح بنی ہوئی ہیں۔ کیا یہ فضول خرچی اس قوم کے رہنماؤں کو بھتی ہے جس کے بہت سے افراد و خاندان نانِ شبینہ سے محروم اور جان و تن کا رشتہ قائم رکھنے سے قاصر ہوں؟ اور پھر یہ سب کچھ کیا بھی جا رہا ہے کس ہستی کے نام پر؟ جو خود تو پیٹ پر پتھر بھی باندھ لیتے تھے، مگر جانوروں تک کی بھوک پیاس سن کر ٹرپ جاتے تھے۔ آج کمیونزم اور لادین سوشلزم،

اسلام کو دانت دکھا رہا ہے۔ جب ہم دنیا کی مقدس ترین ہستی کے نام پر یہ سارا کھیل کھیلیں گے تو لادین طبقے، دین کے بارے میں کیا تاثر لیں گے؟ فضول خرچی کرنے والوں کو قرآن کریم نے ”اخوان الشیاطین“ فرمایا تھا، مگر ہماری فاسد مزاجی نے اس کو اعلیٰ ترین نیکی اور اسلامی شعار بنا ڈالا ہے۔

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجیبت

دوسرے اس فعل میں شیعوں اور رافضیوں کی تقلید ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ رافضی، حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی سالانہ برسی منایا کرتے اور اس موقع پر تعزیہ، علم، دُلدُل وغیرہ نکالا کرتے ہیں، انہوں نے جو کچھ حضرت حسینؑ اور آلِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر کیا، وہی ہم نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر کرنا شروع کر دیا۔ انصاف کیجیے کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ اطہر اور بیت اللہ شریف کا سوانگ بنا کر اسے بازاروں میں پھرانا اور اس کے ساتھ روضہ اطہر اور بیت اللہ کا معاملہ کرنا صحیح ہے تو روافض کا تعزیہ اور دلدل کا سوانگ رچانا کیوں غلط ہے؟ افسوس ہے کہ جو ملعون بدعت رافضیوں نے ایجاد کی تھی، ہم نے ان کی تقلید کر کے اس پر مہر تصدیق ثبت کرنے کی کوشش کی۔

تیسرے: اس بات پر بھی غور کیجیے کہ روضہ اطہر اور بیت اللہ کی جوشبیہ بنائی جاتی ہے، وہ شیعوں کے تعزیہ کی طرح محض جعلی اور مصنوعی جسے آج بنایا جاتا ہے اور کل توڑ دیا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس مصنوعی سوانگ میں اصل روضہ اطہر اور بیت اللہ کی کوئی خیر و برکت منتقل ہو جاتی ہے یا نہیں؟ اور اپنے ہاتھوں کی بنائی ہوئی اس چیز میں کسی درجے میں تقدس پیدا ہو جاتا ہے یا نہیں؟ اگر اس میں کوئی تقدس اور کوئی برکت نہیں تو اس فعل کے محض لغو اور عبث ہونے میں کیا شک ہے؟ اور اگر اس میں تقدس اور برکت کا کچھ اثر آ جاتا ہے تو اس کی شرعی دلیل کیا ہے؟ اور کسی مصنوعی اور جعلی چیز میں روضہ مقدس اور بیت اللہ شریف

سے تقدس و برکت کا اعتقاد رکھنا اسلام کی علامت ہے یا جاہلیت کی؟ اور پھر روضہ شریف اور بیت اللہ شریف کی شبیہ بنا کر اگلے دن اسے توڑ پھوڑ دینا کیا ان کی توہین نہیں؟ آپ جانتے ہیں کہ بادشاہ کی تصویر بادشاہ نہیں ہوتی، نہ کسی عاقل کے نزدیک اس میں بادشاہ کا کوئی کمال ہوتا ہے۔ اس کے باوجود بادشاہ کی تصویر کی توہین کو قانون کی نظر میں لائق تعزیر جرم تصور کیا جاتا ہے۔ اور اسے بادشاہ سے بغاوت پر محمول کیا جاتا ہے۔ لیکن آج روضہ اطہر اور بیت اللہ شریف کی شبیہ بنا کر کل اسے منہدم کرنے والوں کو یہ احساس تک نہیں ہوتا کہ وہ اسلامی شعائر کی توہین کے مرتکب ہو رہے ہیں۔

چوتھے: جس طرح شیعہ لوگ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے تعزیہ پر چڑھاوے چڑھاتے اور منتیں مانتے ہیں۔ اب رفتہ رفتہ عوام کا لانعام اس نوا ایجاد ”بدعت“ کے ساتھ بھی یہی معاملہ کرنے لگے ہیں۔ روضہ اطہر کی شبیہ پر درود و سلام پیش کیا جاتا ہے اور بیت اللہ شریف کی شبیہ کا باقاعدہ طواف ہونے لگا ہے۔ گویا مسلمانوں کو حج و عمرہ کے لیے مکہ مکرمہ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ اطہر کی زیارت کے لیے مدینہ منورہ جانے کی ضرورت نہیں، ہمارے ان دوستوں نے گھر گھر میں روضے اور بیت اللہ بنا دیے ہیں، جہاں سلام بھی پڑھا جاتا ہے اور طواف بھی ہوتا ہے۔ میرے قلم میں طاقت نہیں کہ میں اس فعل کی قباحت و شناعة اور ملعونیت کو ٹھیک ٹھیک واضح کر سکوں۔ ہمارے ائمہ اہل سنت کے نزدیک یہ فعل کس قدر قبیح ہے؟ اس کا اندازہ لگانے کے لیے صرف ایک مثال کافی ہے، وہ یہ کہ ایک زمانے میں ایک بدعت ایجاد ہوئی تھی کہ عرفہ کے دن جب حاجی حضرات عرفات کے میدان میں جمع ہوتے ہیں تو ان کی مشابہت کے لیے لوگ اپنے شہر کے کھلے میدان میں نکل کر جمع ہوتے اور حاجیوں کی طرح سارا دن دعا و تضرع، گریہ و زاری اور توبہ و استغفار میں گزارتے، اس رسم کا نام ”تعریف“ یعنی عرفہ منانا رکھا گیا تھا۔ بظاہر اس میں کوئی خرابی نہیں تھی، بلکہ یہ ایک اچھی چیز تھی کہ اگر اس کا رواج عام ہو جاتا تو کم از کم سال

بعد تو مسلمانوں کو توبہ واستغفار کی توفیق ہو جایا کرتی۔ مگر ہمارے علمائے اہل سنت نے (اللہ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے) اس بدعت کی سختی سے تردید کی اور فرمایا: ”التعریف لیس بشی“ یعنی اس طرح عرفہ منانا بالکل لغو اور بیہودہ حرکت ہے۔

شیخ ابن نجیم صاحب البحر الرائق لکھتے ہیں:

”چونکہ وقوف عرفات ایک ایسی عبادت ہے جو ایک خاص مکان کے ساتھ مخصوص ہے اس لیے یہ فعل اس مکان کے سوا دوسری جگہ جائز نہ ہوگا۔ جیسا کہ طواف وغیرہ جائز نہیں، آپ دیکھتے ہیں طواف کعبہ کی مشابہت کے طور پر کسی اور مکان کا طواف جائز نہیں۔“ (ص ۱۷۶، ج ۲)

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں:

”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو فرمایا کہ ”میری قبر کو عید نہ بنالینا“ اس میں تحریف کا دروازہ بند کرنے کی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ یہود و نصاریٰ نے اپنے نبیوں کی قبروں کے ساتھ یہی کیا تھا، اور انہیں حج کی طرح عید اور موسم بنالیا تھا۔“ (حجۃ اللہ البالغہ) شیخ علی القاری رحمہ اللہ شرح مناسک میں فرماتے ہیں کہ:

”طواف کعبہ شریف کی خصوصیات میں سے ہے۔ اس لیے انبیاء و اولیاء کی قبور کے گرد طواف کرنا حرام ہے۔ جاہل لوگوں کے فعل کا کوئی اعتبار نہیں، خواہ وہ مشائخ و علماء کی شکل میں ہوں۔“ (بحوالہ الحجۃ لاہل السنۃ ص ۷)

اور البحر الرائق، کفایہ شرح ہدایہ اور معراج الدرایہ میں ہے کہ: ”جو شخص کعبہ شریف کے علاوہ کسی اور مسجد کا طواف کرے، اس کے حق میں کفر کا اندیشہ ہے۔“ (الحجۃ لاہل السنۃ ص ۷)

ان تصریحات سے معلوم ہو سکتا ہے کہ روضہ اطہر اور کعبہ شریف کا سوانگ بنا کر ان کے ساتھ اصل کا سا جو معاملہ کیا جاتا ہے، ہمارے اکابر اہل سنت کی نظر میں اس کی کیا



حیثیت ہے۔

خلاصہ یہ کہ ”جشن عید میلاد“ کے نام پر جو خرافات رائج کر دی گئی ہیں اور جن میں ہر آئے سال مسلسل اضافہ کیا جا رہا ہے، یہ اسلام کی دعوت، اس کی روح اور اس کے مزاج کے یکسر منافی ہیں۔ میں اس تصور سے پریشان ہو جاتا ہوں کہ ہماری ان خرافات کی روئیداد جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہِ عالی میں پیش ہوتی ہوگی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر کیا گزرتی ہوگی؟ اور اگر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم ہمارے درمیان موجود ہوتے تو ان چیزوں کو دیکھ کر ان کا کیا حال ہوتا؟ بہر حال میں اس کو نہ صرف ”بدعت“ بلکہ ”تحریف فی الدین“ تصور کرتا ہوں اور اس بحث کو امام ربانی مجدد الف ثانی کے ایک ارشاد پر ختم کرتا ہوں۔ جو انہوں نے اسی مسئلہ میں اپنے مرشد خواجہ باقی باللہ کے بارے میں فرمایا ہے:

”بہ نظر انصاف بیند کہ اگر فرضاً حضرت ایشاں دریں اوان در دنیا زندہ می بودند و ایں مجلس و اجتماع منعقد می شد، آیا بایں امر راضی می شدند، و ایں اجتماع رامی پسندیدند یا نہ؟ یقیناً فقیر آں است کہ ہرگز ایں معنی را تجویز نمی فرمودند، بلکہ انکاری نمودند، مقصود فقیر اعلام بود، قبول کنند یا نہ کنند، ہیچ مضائقہ نیست و گنجائش مشاجرہ نہ۔“

**ترجمہ:-** ”انصاف کی نظر سے دیکھیے کہ اگر بالفرض حضرت ایشاں اس وقت دنیا میں تشریف فرما ہوتے اور یہ مجلس اور یہ اجتماع منعقد ہوتا، آیا آپ اس پر راضی ہوتے اور اس اجتماع کو پسند فرماتے یا نہیں؟ فقیر کا یقین یہ ہے کہ اس کو ہرگز جائز نہ رکھتے بلکہ اس پر نکیر فرماتے..... فقیر کا مقصود صرف امر حق کا اظہار ہے قبول کریں یا نہ کریں کوئی پرواہ نہیں اور نہ کسی جھگڑے کی گنجائش۔“ (دفتر اول مکتوب ۲۷۳)

(اختلاف امت اور صراطِ مستقیم)

مفتی سید عبدالقدوس ترمذی مدظلہم

## یادگار واقعات (قسط ۳)

فقہ العصر حضرت مولانا مفتی سید عبدالشکور ترمذی رحمہ اللہ تعالیٰ

مسئلہ تکفیر میں احتیاط

تکفیر کے مسئلہ میں کس قدر احتیاط کی ضرورت ہے اس سے کوئی بھی اہل علم بطور خاص ارباب افتاء ناواقف نہیں ہیں حضرت علامہ ابن نجیم صاحب البحر الرائق نے تو کلمات کفر نقل فرما کر تصریح فرمائی ہے: ولقد الزمت نفسی ان لا فتی بشئی منها حضرت والد صاحب قدس سرہ اکثر صاحب بحر کی یہ عبارت ایسے موقع پر پڑھ کر سناتے تھے اور اس مسئلہ میں احتیاط کی تاکید فرمایا کرتے تھے علامہ ابن نجیم نے یہ بھی لکھا ہے کہ اگر کسی کے کلام میں ۹۹ وجوہ کفر کی ہوں اور ایک وجہ اسلام کی تو مفتی پر واجب ہے کہ متکلم کی تکفیر نہ کرے بلکہ جو اسلام کی وجہ ہے اس کی طرف میلان کر کے اسلام کا فتویٰ دے ان کے الفاظ یہ ہیں فعلى المفتی ان یميل الیه حضرت فرماتے تھے کہ اسلام کی جس وجہ کا احتمال ہے اس کی طرف میلان مفتی کا تبرع نہیں ہے بلکہ کلمہ علی سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واجب اور اس پر لازم ہے لان الاسلام یعلو ولا یعلیٰ علامہ ابن نجیم کے حوالہ سے اکثر حضرت یہ ہدایت فرماتے تھے۔

ایک مرتبہ احقر نے عرض کیا کہ علامہ عبدالحی لکھنوی نے لکھا ہے کہ اس کے باوجود افسوس یہ کہ صاحب البحر نے خود بھی بعض مقامات پر اس کے خلاف کیا ہے پھر البتہ ملا علی قاری کی انہوں نے تعریف کی ہے کہ تکفیر کے معاملہ میں ان کی احتیاط قابل داد ہے پھر احقر نے علامہ لکھنوی کی اصل عبارت حضرت کو پڑھ کر سنائی اس پر بہت خوش ہوئے فرمایا کہ مولانا لکھنوی نے صحیح فرمایا ہے ان کی گرفت صحیح اور اصول کے مطابق ہے اہل علم کی ضیافت

طبع کیلئے وہ عبارت ذیل میں تحریر کی جاتی ہے علامہ لکھنوی شرح فقہ الاکبر کی عبارت نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

قلت جزى الله القارى خير الجزا حيث حقق ما هو المختار عند ارباب  
الاتقاء وانى اتعجب من ارباب الفتاوى كيف لا يحطاطون فى امر التكفير مع  
قولهم من كان فى كلامه الا واحد محملا يوجب تكفيره لا يكفرو وقد التزم  
صاحب البحر الرائق ان لا يفتى بشئ من الفاظ التكفير المنقولة فى الفتاوى  
الا انه خرج عن التزامه ونسى ما قدمه يداه فى بعض المسائل كمسألة تكفير  
الروافض فانه مال الى تكفيرهم بقولهم سب الشيخين كفر وامثاله ولم  
يفهم ان هذه الامور التى صدرت عنهم انما هى لشبهة عرضت لهم فتكون  
مانعة من التكفير كما حققه ابن الهمام فى تحرير الاصول وغيره وقد التزمت  
ان بعون الله تعالى ان لا افتى بشئ من الفاظ التكفير المنقولة فى الفتاوى فى  
موضع من المواضع ان شاء الله تعالى ولو لانه يجوز حمل كلامهم على  
التهديد والتشديد وهول كلامهم محمل شديد لكان اطلاق الفقهاء عليهم غير  
سديد فان الفقيه من يتدبر ويتفكر لا من يمشى على الظاهر ولا يتدبر ولنعم  
ما خطر بخاطرى۔ (احكام القنطره ص ۹۷ رسائل الكنوى ج ۱)

اثر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما

احقر نے ایک مرتبہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے اثر کے بارہ میں سوال کیا  
جس پر حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ نے مستقل رسالہ ”تحذیر الناس  
من انکار اثر ابن عباس“ تحریر فرمایا ہے حضرت والد صاحب نے فرمایا کہ یہ اثر صحیح ہے اور  
حضرت نانوتوی نے اس کی جو شرح فرمائی ہے وہ علمی اور اداق ہے معترضین نے بلا سمجھے اس  
پر اعتراض شروع کر دیئے حالانکہ حضرت نے جو مضمون بیان فرمایا ہے وہ اس میں متفرد نہیں

ہیں بعض دیگر اہل اللہ سے بھی یہ منقول ہے اثر ابن عباس سے متعلق مزید فرمایا کہ اس کا انکار صحیح نہیں ہے بعض حضرات نے اس کی صحت سے انکار کیا ہے یہ خلاف تحقیق ہے پھر فرمایا کہ اس اثر کی صحت سے متعلق مولانا عبدالحی لکھنوی نے بہت عمدہ کلام کیا ہے اور اصول حدیث پر اس کی صحت کو ثابت کیا ہے نیز اس کی مفید شرح بھی انہوں نے فرمادی ہے جس سے حضرت نانوتوی کی تائید ہوتی ہے حضرت مولانا لکھنوی کے اس پر تین رسائل ہیں ”آیات البینات علی وجود الانبیاء فی الطبقات“ دافع الوسواس فی اثر ابن عباس“ زجر الناس علی انکار اثر ابن عباس“ پہلے دو رسالے اردو زبان میں ہیں تیسرا رسالہ جو سب سے آخر ۱۲۹۲ھ میں لکھا وہ عربی میں ہے اس رسالہ ”زجر الناس“ میں انہوں نے افراط و تفریط سے ہٹ کر معتدل مسلک کو اختیار فرمایا ہے چنانچہ خود فرماتے ہیں:

سلکت فیہا مسلکا متوسطا مجتنباً عن افراط فرقة و تفریط فرقة فان سعت فی ابطال الاثر المذكور و حکمت علیہا لضعف والوضع ونحو ذالك من اباطیل الامور وفرقة مالت الی تقویته من حیث الاسناد فسرہ بتفسیر ادی الی الفساد وانالست براض لا بهذا ولا بذالك بل اخترت الطريق الوسط فیما هنالك (ص ۳)

اس کے بعد دو باب قائم فرما کر اس پر مبسوط کلام کیا ہے پہلے باب میں اس اثر پر کئے جانے والے تمام شبہات کا کافی وافی ثانی جواب تحریر فرمایا ہے اور اس کی اسنادی حیثیت کے بارے میں یہ فیصلہ فرمادیا کہ شاذ ہونے کے باوجود یہ اثر صحیح ہے یا حسن۔ سندی بحث کا خلاصہ ان کے اپنے الفاظ میں یہ ہے:

فظهر من هذا ظهور الشمس فی وسط السماء ان من تكلم فی صحة الاثر الذی نحن فیہ بشذوذہ اشتبه علیہ المردود بالمقبول فكلامه مردود غیر مقبول كائن من كان لمخالفته شهادة البرهان فليُنظر الی ما قال ولا ينظر الی من

قال جن حضرات نے اس اثر کے قبول کرنے سے انکار کیا تھا ان کے اقوال کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد فرماتے ہیں:

وهذه كلماتهم في عدم قبول الاثر المذكور وقد علمت ان شيئا منها لا يصلح لان يقبل واحد منها بقول منصور وهناك كلمات اخر تسميتها بالخرافات اخرى وهي من المذكورات اخذت لانضيق الوقت بذكرها والرد عليها۔

حضرت مولانا نے دوسرے باب میں اثر مذکور کے معنی پر بحث کرتے ہوئے تین مسلک ذکر فرمائے ہیں اور تیسرے مسلک جس کو مسلک التحقيق سے تعبیر فرمایا اسی کو مختار اور احسن و ابہی قرار دے کر آخر میں تحریر فرماتے ہیں:

فظهران اثر ابن عباس مما لا غبار عليه لا سند او لا متنا ولا مبني ولا معني۔  
حضرت علامہ عبدالغنی مجددی دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس رسالہ کی تصدیق ان الفاظ میں فرمائی ہے:

وما كتبه الفاضل القوي مولانا الشيخ عبدالحی احرى للقبول۔  
حضرت والد صاحب فرماتے تھے کہ واقعہً یہ تحقیق احرى للقبول ہے مخالفین خواہ مخواہ اعتراض کرتے ہیں ابھی چند سال قبل ایک عالم نے جو معقول و منقول میں اچھی شہرت رکھتے ہیں اثر مذکور پر چند اعتراض لکھ کر ارسال کئے تھے بزعم خویش وہ ان سوالات کو لائیکل سمجھتے تھے لیکن حضرت علامہ لکھنوی کے رسالہ دیکھنے سے معلوم ہوا کہ انہوں نے ان تمام سوالات سے تعرض فرما کر ان کا مسکت جواب تحریر فرما دیا ہے ہمارے اکابر پر منجملہ دیگر اعتراضات کے ایک اعتراض چونکہ یہ بھی شد و مد سے کیا جاتا ہے اس لئے حضرت بڑے اہتمام سے اس کا رد فرمایا کرتے تھے احقر نے بھی اس لئے قدرے اس کی تفصیل لکھ دی ہے تفصیل کیلئے اہل علم مذکورہ رسائل کا مطالعہ فرمائیں۔

## مسئلہ فاتحہ خلف الامام

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ دیوبند میں ابوداؤد شریف کا سبق پڑھا رہے تھے اور مسئلہ فاتحہ خلف الامام پر بحث چل رہی تھی حضرت مفتی صاحب نے حنفیہ کے مسلک کو دلائل سے ثابت فرمایا جس کا حاصل یہ تھا کہ امام کے پیچھے جہری اور سری دونوں نمازوں میں مقتدی کیلئے فاتحہ پڑھنا جائز نہیں ہے ایک طالب علم نے کہا کہ حضرت مولانا عبدالحی لکھنوی نے اپنے رسالہ ”ام الکلام“ کے حاشیہ پر لکھا کہ حنفیہ کے ہاں سری نماز میں مقتدی کیلئے فاتحہ خلف الامام کی گنجائش ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سری نماز میں مقتدی کیلئے فاتحہ پڑھنا ناجائز نہیں ہے حضرت مفتی صاحب نے فوراً فرمایا کہ بھائی مولانا عبدالحی صاحب کون ہیں کس صدی کے عالم ہیں اور کہاں رہتے ہیں اب ان سوالات سے طالب علم پریشان ہو گیا اور اس کو کچھ جواب نہ بن پڑا جبکہ حضرت کا منشا یہ تھا کہ حضرت مولانا لکھنوی اگرچہ ایک متبحر اور محقق عالم ہیں مگر وہ تیرھویں، چودھویں صدی کے عالم ہیں مجتہد نہیں ہیں اور ہم اس مسئلہ میں امام اعظم کے مقابلہ میں مجتہد عالم حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا قول بھی تسلیم نہیں کرتے تو مولانا لکھنوی کا قول حضرت امام صاحب کے مقابلہ میں کیسے تسلیم کر لیں گے؟ سائل نے یہ نہیں سوچا کہ وہ حضرت موصوف کا مقابلہ کس سے کر رہا ہے اس لئے اس نے یہ سوال کر دیا ورنہ اگر وہ اس حقیقت کو سمجھ لیتا تو اسے ہرگز اشکال نہ پیش آتا اور نہ ہی وہ یہ معارضہ کرتا۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ واقعہً حضرت مفتی صاحب نے یہ بڑے کام کی بات اور کارگر اصول و ضابطہ بیان فرما دیا ہے ورنہ عام طور پر طلبہ اور عام لوگ اس قسم کے مغالطہ کا شکار ہو جاتے ہیں کہ فلاں عالم یا بزرگ کا یہ ارشاد فلاں امام کے خلاف ہے اس ضابطہ سے معلوم ہوا کہ بعد کے علماء کرام کے اقوال شاذہ کی بناء پر متقدمین مجتہدین کے مسلک سے معارضہ درست نہیں ہے اس ضابطہ کی روشنی میں بہت سے سوال خود بخود ختم ہو جاتے ہیں۔



## تفسیر بیان القرآن

حضرت اقدس حکیم الامت تھانوی قدس سرہ کی عظیم شاہکار علمی تفسیر ”بیان القرآن“ کا لوہا علمی دنیا میں مسلم ہے حضرت تھانوی نے اڑھائی سال کی مدت میں اس کو بارہ جلدوں میں مکمل فرمایا یہ نہایت مختصر اور جامع تفسیر ہے اس کی قدر صحیح معنی میں وہ حضرات پہچان سکتے ہیں جو اس میدان کے شناس اور ماہر ہیں سطحی نظر سے دیکھنے والوں کے نزدیک تو شاید حضرت کے مختصر تفسیری نوٹ اور بین القوسین مختصر سی عبارت کی اتنی اہمیت یا قدر نہ ہو مگر ماہرین علم تفسیر کے ہاں اس کی قدر مسلم ہے حضرت والد صاحب فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ حضرت تھانوی ظہر کی نماز کا وضو فرما رہے تھے جب آپ قدم مبارک دھونے لگے تو والد صاحب (حضرت مفتی عبدالکریم گمٹھوی) کو آواز دی مولوی عبدالکریم جب وہ حاضر ہوئے تو ارشاد فرمایا کہ مولوی عبدالکریم بیان القرآن کے بین القوسین کی مختصر سی عبارت کو عام طور پر معمولی سمجھا جاتا ہے عام لوگوں کو اس کی قدر نہیں ہو سکتی اس کی قدر اس کو ہوگی جسے تفسیر میں کوئی اشکال پیش آجائے اور دس بارہ تفاسیر دیکھ کر بھی وہ حل نہ ہو بلکہ اس کی گاڑی اٹک جائے اور پھر بین القوسین کی اس مختصر سی عبارت سے اس کی گاڑی چل پڑے ایسے شخص کو اس کی صحیح معنی میں قدر ہو سکتی ہے۔

حضرت والد صاحب فرماتے تھے ”گاڑی اٹک جائے“ یہ حضرت والا کے الفاظ مبارک تھے جواب تک میرے کانوں میں گونج رہے ہیں اور حضرت کا یہ ارشاد مبارک سو فیصد درست ہے واقعہً بیان القرآن کی قدر اسی شخص کو ہو سکتی ہے جس کی گاڑی اٹک جائے اور دوسری تفاسیر سے نہ چل سکے اور پھر حضرت کے تفسیری نوٹ سے وہ چل پڑے۔

## حیلہ ناجزہ کی تالیف

مسلمان خواتین کی مشکلات کے حل کیلئے حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہ نے کتاب ”الحیلۃ الناجزۃ للخلیۃ العاجزۃ“ تیار کرائی جس میں مفقود الخبر، معنت، مجنون کی

بیوی کے احکام بیان فرمائے گئے ہیں بعض مسائل میں فقہ مالکی پر بھی فتویٰ دیا گیا ہے بنیادی طور پر اس کتاب کی تالیف میں حضرت حکیم الامت تھانوی کی نگرانی میں حضرت مفتی اعظم مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی اور حضرت مفتی عبدالکریم صاحب کھٹولی نے اہم حصہ لیا علماء دیوبند و سہارنپور نے بھی اس میں نمایاں شرکت فرمائی پانچ سال کی محنت سے کتاب تیار ہو کر طبع ہوئی ان مسائل و مشکلات کے حل میں اس کتاب سے آج تک راہنمائی حاصل کی جا رہی ہے بحمد اللہ تعالیٰ اس کا نفع برابر جاری و ساری ہے حضرت والد صاحب نے بیان فرمایا کہ جب کتاب مکمل ہوئی تو ان دونوں حضرات نے حضرت سے عرض کیا کہ اس پر دستخط فرمادیئے جائیں حضرت نے فرمایا کہ یہ تو آپ حضرات نے لکھی ہے آپ ہی دستخط کریں میری شرکت اس میں برائے نام تھی ان حضرات نے عرض کیا کہ حضرت یہ جو کچھ ہوا آنجناب کی سرپرستی اور نگرانی و ہدایت پر ہی ہوا ہے ہر جزو میں جناب کی شرکت برابر رہی ہے ہم خدام نے تواقتال امر کے طور پر ہی اس میں شرکت کی سعادت حاصل کی ہے اصل تو آنجناب ہی کی توجہ اس میں کارفرما رہی جناب ہی کی طرف اس کی نسبت ضروری ہے اس لئے حضرت ہی دستخط فرمادیں حضرت نے رسالہ مسودہ لے کر اس کے آخر میں یہ عبارت تحریر فرمائی:

وهنا تمت الرسالة والحمد لله الهادي في كل مقالة كتبها احقر  
اشرف على عفى عنه ذنبه الخفى والجلى بمشاركة الفاضلين الجامعين للعلم  
القويم والعمل المستقيم المولوى محمد شفيع والمولوى عبدالكريم شرفهما  
الله تعالى بالاجر العظيم (الخ)

جب ان حضرات نے یہ عبارت پڑھی تو ان کی حیرت اور مسرت کی انتہا نہ رہی حضرت اقدس نے اپنے قلم مبارک سے ان کے متعلق جو کلمات تحریر فرمائے تھے وہ ان کیلئے نہایت درجہ اعزاز اور باعث سعادت اور موجب فرح تھے بلاشبہ ان کیلئے یہ بہت بڑی سند

ہے کیونکہ حضرت کے ہاں خلاف حقیقت تو دور کی بات ہے مبالغہ کا بھی گزرنہ تھا حضرت جب یہ کلمات مبارکہ تحریر فرما کر گھر تشریف لے گئے تو ان دونوں حضرات میں اس پر گفتگو ہوئی حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ بھائی تم حضرت کے زیادہ قریب تھے اس رسالہ میں شرکت کا زیادہ موقع تمہیں ملا اس لئے قافیہ میں حضرت والا نے آپ کا نام لکھا اور کلام میں مقصود قافیہ ہی ہوتا ہے حضرت مولانا مفتی عبدالکریم صاحب نے فرمایا کہ: لَنَا الْقَافِيَةُ وَلَكُمْ التَّقْدِيمُ اور الفضل للمتقدم بھی مسلم ہے یہ جواب بھی چونکہ قافیہ پر تھا اس لئے اس سے مزید لطف دو بالا ہو کر محفل کشت زعفران بن گئی۔

حضرت والد صاحب فرماتے تھے کہ حضرت اقدس تھانوی اس کتاب کی تکمیل پر ان حضرات سے اتنے خوش تھے کہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ دونوں میرے لئے بمنزلہ عینین ہیں ایک کے شروع میں ع ہے یعنی عبدالکریم اور ایک کے آخر میں ہے یعنی محمد شفیع۔ محقق العصر علامہ محمد تقی عثمانی مدظلہم نے بھی حضرت مفتی صاحب کے حوالہ سے حضرت کا یہ ارشاد نقل فرمایا ہے ملاحظہ ہو البلاغ ذوالقعدہ ۱۴۲۱ھ۔

### سجدہ تحیۃ کی حرمت

ایک مرتبہ حضرت والد صاحب نے یہ واقعہ سنایا کہ دیوبند میں ایک بزرگ عالم نے حضرت والد صاحب سے فرمایا کہ سجدہ تعظیمی کی حرمت ثابت کرنے کیلئے ”بیان القرآن“ میں روایات حدیث سے استدلال کیا گیا ہے آیت قرآنیہ لَا تَسْجُدُوا لِلشَّمْسِ سے کیوں نہیں استدلال کیا گیا؟ حضرت والد صاحب نے جواب میں فرمایا کہ اس آیت سے استدلال نہیں کیا جاسکتا تھا کیونکہ اس آیت میں سجدہ تحیۃ کی ممانعت نہیں ہے بلکہ سجدہ عبادت کی ممانعت ہے سجدہ تحیۃ کہ ممانعت اس سے ثابت نہیں ہوتی کیونکہ آیت کے آخر میں ان کنتم ایاہ تعبدون سے واضح ہے کہ یہاں سجدہ عبادت کا ذکر ہے یہی وجہ ہے کہ بیان القرآن میں اس آیت سے سجدہ تحیۃ کی ممانعت پر استدلال نہیں کیا گیا یہ تقریر اور

جواب سن کر وہ بزرگ عالم پھر ک اٹھے اور بہت محظوظ ہوئے۔

### تعدد جمعہ کا حکم

فقہاء حنفیہ کے ہاں مفتی بہ قول کے مطابق جس شہر یا قریہ کبیرہ میں شرعاً جمعہ ہوتا ہو وہاں جمعہ کا تعدد بھی جائز ہے بعض حضرات تعدد جمعہ کے عدم جواز کے قائل ہیں حضرت والد صاحب نے واقعہ سنایا کہ مراد آباد میں ایک عالم جناب حضرت مولانا عبدالحق صاحب مدنی نے تعدد جمعہ کے عدم جواز پر ایک رسالہ ”القول الجامع“ کے نام سے عربی میں تحریر کیا تھا اس میں تعدد کے عدم جواز کو ثابت کیا گیا تھا حضرت مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب چاند پوری نے جواب کیلئے یہ رسالہ تھانہ بھون حضرت تھانوی کی خدمت میں بھیجا حضرت نے اس کے جواب کیلئے والد صاحب کو مامور فرمایا چنانچہ انہوں نے نہایت تفصیل سے اس کا جواب لکھا اور تعدد جمعہ کو مفتی بہ اور جائز قرار دیا۔

حضرت حکیم الامت تھانوی نے ”نعم الجواب وهو عین الصواب“ کے وقع الفاظ سے اس کی تصدیق و تحسین فرمائی۔

حضرت علامہ انور شاہ کشمیری نے بھی اس کو پسند فرمایا اور اپنے تصدیقی کلمات میں لکھا کہ: ”یہ تحریر خاصی استقراء سے لکھی گئی ہے۔“

حضرت مولانا مرتضیٰ حسن صاحب نے بھی اس کو بہت پسند فرمایا۔ ”تجدد الجمعۃ فی تعدد الجمعۃ“ کے نام سے اس کو شائع فرما کر مراد آباد وغیرہ میں تقسیم کیا۔ حضرت چاند پوری نے حضرت والد صاحب سے فرمایا کہ مولوی صاحب مٹھائی کھلاؤ تم نے ایسا زبردست جواب لکھا ہے کہ اس کی توقع بڑے حضرات بطور خاص حضرت گنگوہی سے کی جاسکتی تھی۔

(جاری.....)

منفی محمد راشد سکوی جامعہ فاروقیہ کراچی

## ”باتیں اُن کی، یاد رہیں گی“ (آخری قسط ۲)

۲۰۰۸م میں جب بندہ نے اُستادِ محترم رحمہ اللہ کے پاس صحیح البخاری پڑھی تو دل اللہ کے سامنے تشکر بھرے جذبات کے ساتھ سجدہ ریز تھا، کہ جو امتیاز مدرسہ عربیہ رائے ونڈ کے دورہ حدیث کو حاصل تھا، وہ معاصر اداروں میں کہیں نظر نہیں آتا تھا، دیگر جامعات و مدارس عربیہ کی تنقیص مقصود نہیں، محض مدرسہ عربیہ رائے ونڈ کی وجہ امتیاز سامنے رکھنا مقصود ہے، تاکہ ہماری طرف سے شکرِ نعمت و تحذیر بالنعمت والا معاملہ ہو سکے، اور اس وقت مدرسہ عربیہ رائے ونڈ میں موجود زیرِ درس طلباء کرام پوری ذمہ داری، حاضر دماغی اور شرح و بسط کے ساتھ وقت کے ان عظیم شیوخ سے خوب سے خوب استفادہ کر سکیں۔

مدرسہ عربیہ رائے ونڈ میں موجودہ وقت کے کبار مشائخ عظام، صاحبِ نسبت، عالی السند، علم و عمل کے جامع علمائے کرام کا بیک وقت ایک جگہ صحاح ستہ کا درس دینا وہاں کا طرہ امتیاز ہے، تفصیل اس اجمال کی کچھ اس طرح ہے کہ دیگر جامعات میں سے کسی بھی ادارے کی طرف دیکھ لیجیے، اس دور میں وہاں صرف ایک یا زیادہ سے زیادہ دو شخصیات ایسی نظر آئیں گی جو عالی السند ہیں، مثلاً: ہمارے اس دور میں سب سے عالی السند اُن حضرات کی ہے جو شیخ الاسلام حضرت حسین احمد مدنی رحمہ اللہ اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ کے درمیان صرف چار واسطے ہیں (اور یہ بات پوری طرح جائزہ لینے کے بعد کہی جا رہی ہے کہ پورے پاکستان میں چند گنے چنے مدارس ہی ایسے ہیں جہاں حضرت مدنی کے شاگرد موجود ہوں، اُن اداروں میں بھی اس ایک ہستی کے علاوہ ان کے ہم پلہ عالی السند کوئی اور نظر نہیں آتا، اِلا ماشاء اللہ۔ لیکن مدرسہ عربیہ رائے ونڈ میں دیکھیے!

اُستادِ محترم حضرت مولانا جمشید علی صاحب رحمہ اللہ، شیخ الاسلام حضرت حسین

احمد مدنی رحمہ اللہ کے شاگرد تھے، (یعنی: اُستادِ محترم رحمہ اللہ اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ کے درمیان صرف پانچ واسطے تھے)

اُستادِ محترم حضرت مولانا نذر الرحمن صاحب دامت برکاتہم العالیہ، حضرت مولانا سلطان محمود صاحب رحمہ اللہ کے شاگرد ہیں جو علامہ انور شاہ کشمیری اور شیخ الہند رحمہما اللہ کے شاگرد ہیں، (اس طرح اُستادِ محترم حضرت مولانا نذر الرحمن صاحب دامت برکاتہم العالیہ اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ کے درمیان بھی صرف پانچ واسطے بنے)

اور اُستادِ محترم حضرت مولانا احسان الحق صاحب دامت برکاتہم العالیہ، حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب رحمہ اللہ کے شاگرد ہیں، (اس طرح اُستادِ محترم حضرت مولانا احسان الحق صاحب دامت برکاتہم العالیہ اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ کے درمیان بھی صرف پانچ واسطے بنے)

اور اُستادِ محترم حضرت مولانا محمد جمیل صاحب دامت برکاتہم العالیہ، حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب رحمہ اللہ کے شاگرد ہیں اور وہ حضرت مولانا سلطان محمود صاحب کے، (اس طرح اُستادِ محترم حضرت مولانا محمد جمیل صاحب دامت برکاتہم العالیہ اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ کے درمیان صرف چھ واسطے بنے)

اس خاص وصف کو دیکھتے ہوئے شدید خواہش تھی کہ دورہ حدیث تو رائے و نڈ میں ہی ہونا چاہیے، کہ چلو کچھ نسبت تو ہو، عملی میدان میں آگے برہنے کی توفیق بھی اللہ تعالیٰ اس کی برکت سے دے ہی دیں گے، ان شاء اللہ۔ اسباق کے پڑھانے میں ان تمام مشائخ کا اپنا اپنا جُدا گانہ انداز تھا، اس وقت مقصود صرف اُستادِ محترم حضرت مولانا جمشید علی صاحب رحمہ اللہ کے اندازِ تدریس کے بارے میں روشنی ڈالنا مقصود ہے، اُستادِ محترم سبقت پڑھانے کے لیے تشریف لاتے، تشریف فرما ہوتے ہی، ”ہاں بھائی، چلو شروع کرو“ کہہ کے سبق کا آغاز فرماتے، نظر والی عینک آنکھوں پر ہوتی، اور پوری طرح سو فیصد کتاب کی

طرف متوجہ ہو جاتے تھے، گویا کہ دائیں بائیں کسی اور طرف کا بالکل ہوش ہی نہیں رہتا تھا، ترتیب یہ ہوتی تھی کہ ایک طالب علم صحیح البخاری کا ایک صفحہ پڑھتا تھا، طالب علم ایک حدیث پڑھ کے اس کا ترجمہ کرتا، اور اس وقت اُستاد محترم نے اس حدیث سے متعلق تشریحی یا وضاحتی بات ارشاد فرمائی ہوتی تو فرما دیتے تھے ورنہ طالب علم ترجمہ کر کے آگے چلتا رہتا، البتہ جیسے ہی وہ اعراب یا ترجمہ کی غلطی کرتا تو اُستاد محترم اسی وقت ”ہوں“ کہہ کر اسے متوجہ کرتے، اگر وہ غلطی ٹھیک کر لیتا تو ٹھیک ورنہ اُستاد محترم رحمہ اللہ اسے درست کر دیتے۔

سبق ختم ہونے کے بعد طلبہ کی طرف سے سوالات کی پرچیاں پیش کی جاتی تھیں، ایک متعین طالب علم سوال اونچی آواز میں پڑھ کے سناتا، اُستاد محترم اسی وقت فی البدیہہ اپنے مخصوص انداز میں ٹھہر ٹھہر کے مُسکات جواب ارشاد فرما دیتے، اُستاد محترم کے بارے میں سنا ہوا تھا، کہ آپ نے خواب میں اللہ تعالیٰ کی زیارت کی ہوئی ہے، اس بات کی تصدیق کی خاطر ایک بار (جب کہ سبق موجودہ جدید مسجد کے تہ خانے میں ہو رہا تھا) پرچی لکھی، کہ اُستاد جی! آپ کے بارے میں مشہور ہے کہ ”آپ کو خواب میں اللہ تعالیٰ کی زیارت ہوئی ہے“ کیا یہ بات صحیح ہے؟ اس پر اُستاد محترم نے ڈانٹ کر خاموش کروادیا، فرمایا: ”نالائق کہیں کے، ایسی باتیں نہیں پوچھتے۔“ بندہ حیران پریشان، کہ یہ کیا بنی؟! اُستاد محترم کا مقصود اس انداز سے جواب دینے سے اس بات کی تردید کرنا تھا، یا اس طرح کی باتوں کے افشاء سے روکنا تھا؟! واللہ اعلم بالصواب، خیر! پھر ایک دن سبق کے بعد جب دیکھا کہ اُستاد محترم بہت زیادہ خوشگوار موڈ میں ہیں تو بندہ نے دوبارہ اُسی سوال کی پرچی بھیج دی، اب کی بار اُستاد محترم نے آہستہ سے فرمایا: ”الحمد للہ! ایک سے زیادہ بار۔“

اس واقعے کے بارے اُستاد محترم کے خدام سے ایک اور واقعہ سنا کہ ایک شخص نے حاضر خدمت ہو کر دریافت کیا کہ حضرت! آپ کے بارے میں سنا ہے کہ آپ کو خواب میں اللہ تعالیٰ کی زیارت ہوئی ہے؟ تو اُستاد محترم نے اپنے مخصوص لہجے میں فرمایا: ”بھائی! جو سنا

ہے وہ ٹھیک سنا ہے، اس طرح کی باتوں کے پیچھے نہیں پڑتے، جاؤ، جا کے اپنا کام کرو۔“  
 اسی طرح اُستادِ محترم رحمہ اللہ سے بیانات میں بارہا سنا کہ ”جس نے زُلفیں رکھنی  
 ہوں تو وہ چالیس سال کے بعد رکھے۔“ چنانچہ! اس کے بارے میں بندہ نے پرچی بھیجی،  
 کہ کیا زُلفیں چالیس سال کے بعد رکھنا سنت ہے؟ اس کے جواب میں اُستادِ محترم رحمہ اللہ  
 نے فرمایا: ”نہیں بھائی! زُلفیں رکھنے کی سنت پر عمل کرنے کے لیے عمر کی کوئی قید نہیں ہے،  
 لیکن! موجودہ زمانے میں جب ہم نفس و شیطان کے آگے مغلوب ہوئے پڑے ہیں، تو نام  
 سنت کا استعمال ہوتا ہے، جبکہ وہاں اتباعِ نفس چھپی ہوتی ہے، چالیس سال سے قبل بناؤ  
 سنگھار کا جذبہ غالب ہوتا ہے، اور یہ بات سب کو معلوم ہے کہ زُلفیں رکھنے سے خوبصورتی  
 میں اضافہ ہوتا ہے، تو مقصود یہ ہوتا ہے اور نام سنت کا استعمال کرتے ہیں، دوسری طرف  
 چالیس سال کے بعد عام طور پر بناؤ سنگار کا جذبہ سرد پڑ جاتا ہے، اُس وقت یہ کام کیا جائے  
 گا تو پھر کسی قسم کا اشکال نہیں، البتہ! اگر کسی کا مقصود واقعاً اتباعِ سنت ہی ہو تو ضرور رکھے،  
 خلاصہ یہ کہ ہمارا یہ کہنا حکم شرعی نہیں ہے، لیکن مصلحتاً اس طرح بیان کر دیا جاتا ہے۔“

الغرض! اُستادِ محترم رحمہ اللہ کے سمجھانے کا انداز انتہائی سادہ اور آسان ہوتا تھا  
 کہ کمزور سے کمزور ذہن والا بھی بات پوری طرح سمجھ کر مطمئن ہو جاتا تھا، احکامِ شریعت  
 میں مسئلہ تقدیر ایسا مسئلہ ہے کہ علماء کرام نے صاف صاف لکھا ہے کہ اس مسئلہ کے بارے  
 میں کھود کرید کرنا، اور اس کی باریکیوں میں الجھنا اور اس بارے زیادہ قیل وقال کے چکروں  
 میں پڑنا جائز نہیں ہے، اس مسئلہ پر بس اجمالی ایمان رکھنے کا حکم ہے، اس مسئلہ کے بارے  
 میں اُستادِ محترم رحمہ اللہ نے نہایت سادہ انداز میں تفصیل بیان کی کہ الحمد للہ! تشفی ہو گئی،  
 اس کا خلاصہ ذیل میں لکھتا ہوں، فرمایا:

”پہلی بات تو سمجھو کہ ایک لفظ ہے تقدیر؛ اس کے معنی ”اندازہ لگانا“ ہے۔ دوسرا لفظ  
 ہے، تجبیر؛ اس کے معنی ”جبر اور زیادتی کرنا“ ہے۔ اور تیسرا لفظ ہے تجبیر؛ اس کے معنی ”خبر دینا“



“ہے۔ اب دوسری بات یہ سمجھو کہ انسان کا اندازہ غلط ہو سکتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کا اندازہ غلط نہیں ہو سکتا، کیونکہ وہ تو ماضی، حال اور مستقبل کا علم بھی رکھتا ہے، چنانچہ! اس کے علم محیط ہونے کی وجہ سے اس کا اندازہ بالکل ٹھیک بیٹھے گا، اُس میں غلطی نہیں ہو سکتی۔ یہ ہوگئی دو باتیں، اب تیسری بات سمجھو کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اختیار دیا ہے کہ اس دُنیا میں فرمانبرداری یا نافرمانی والی زندگی میں سے جو زندگی گزارنا چاہو، گزار کے آؤ، دُنیا میں تم پر کوئی جبر نہیں، لیکن قیامت والے دن فرمانبرداروں کو نافرمانوں سے جدا کر دیا جائے گا، فرمانبردار اللہ تعالیٰ کے مہمان خانے (جنت) میں ہوں گے اور نافرمان اللہ کی جیل (جہنم) میں ہوں گے۔

پھر فرمایا: ان ابتدائی باتوں کو اچھی ذہن میں بٹھائیں اور اس کے بعد ایک مثال سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ نے ایک بچے کو وجود دیا، اور اس کی عمر مثلاً: تیس سال لکھ دی، کہ دُنیا میں یہ بچہ تیس سال زندہ رہے گا، اب تیسری بات ذہن میں لاؤ کہ اس بچے نے اپنے اختیار کے مطابق دنیا میں تیس سال کی زندگی گزاری، حتیٰ کہ اپنی زندگی آخری لمحے میں یا آخری سانس میں وہ اپنے اختیار سے نماز پڑھ رہا تھا، سجدے کی حالت میں تھا، کہ اُس کا وقت پورا ہوا اور فرشتے نے اس کی روح قبض کر لی، تو اس کا خاتمہ سعادت کے ساتھ سجدے کی حالت میں ہوا۔ اب واپس لوٹ کے اس کی پیدائش کے وقت کے پاس آ جاؤ، جب فرشتے نے اس بچے کے جسم میں روح ڈالی تو اللہ تعالیٰ نے اپنے مستقبل کے علم میں دیکھتے ہوئے یہ دیکھ لیا کہ یہ بچہ اپنے اختیار کو استعمال کرتے ہوئے اپنا آخری سانس سجدے کی حالت میں پورا کرے گا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے علم کی بدولت اپنے اندازے کو لوح محفوظ میں لکھ دیا کہ یہ بچہ سعادت کی موت سجدے کی حالت میں اس دنیا سے جائے گا، اُستاذِ محترم رحمہ اللہ نے فرمایا: یہ تھا اللہ تعالیٰ کا اندازہ جو غلط نہیں ہو سکتا، اسے کہتے ہیں تقدیر، یعنی: اللہ تعالیٰ کا اندازہ۔ پھر فرمایا: میرے عزیزو! اب بتاؤ کہ اُس بچے کی سجدے کی حالت میں موت تقدیر میں یہی کچھ لکھا ہوا ہونے کی وجہ سے ہوئی یا اُس کے اپنے اختیار کو استعمال کرنے کی وجہ سے ہوئی؟ پھر خود ہی فرمایا: کہ اس کی یہ موت تقدیر میں لکھا ہوا

ہونے کی وجہ سے نہیں ہوئی، اس لیے کہ اگر ایسا کہیں گے تو یہ ”تجبر“ یعنی جبر کرنا ہوگا، جس کی وجہ سے یہ کہا جائے گا کہ انسان تقدیر کے ہاتھوں مجبور تھا، حالانکہ اللہ نے تو انسان کو اس دنیا میں مجبور نہیں رکھا بلکہ اختیار دیا ہے، لہذا یہ کہنا اللہ کی شان کے بھی خلاف ہے اور اللہ کے اصول کے بھی۔ چنانچہ لوگوں کی زبانوں پر جو یہ جملہ ہوتا کہ ”بھائی تقدیر میں ہی ایسا لکھا ہوا تھا، ہم کیا کر سکتے ہیں“، تو اچھی سمجھ لیں کہ اس کا مطلب یہ ہوتا کہ اختیار تو بندے کا استعمال ہوا، لیکن یہ سب کچھ (یعنی: بندے کا اپنے اختیار کو استعمال کرنا) اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا، اور اللہ نے اپنے اس اندازے کو لکھ دیا تھا، جو تقدیر کہلایا، لہذا محاورے میں اس اختیاری فعل کی نسبت اُس لکھی ہوئی تقدیر کی طرف کر کے بول دیتے ہیں، جس کا مطلب صرف اور صرف یہ بنتا ہے کہ جو کچھ بھی ہوا ہے، وہ ہوا تو اس بندے کے اپنے اختیار سے ہے البتہ اس کے اپنے فعل کو تقدیر میں لکھ دیا گیا تھا۔ دو لفظوں میں خلاصہ سننا چاہو تو یہ بنے گا کہ انسان کے اچھے اور بُرے افعال تقدیر میں لکھا ہوا ہونے کی وجہ سے نہیں ہوتے بلکہ اس کے اپنے اختیار سے یہ سب کچھ ہوتے ہیں، جن کی خبر اللہ تعالیٰ نے عالم الغیب ہونے کی وجہ سے معلوم کر کے لکھ کر دی ہوتی ہے، اسے ہی تقدیر کہتے ہیں۔

تقدیر سے متعلق اُستاد محترم کی اس گفتگو کو دیکھ لیں کہ کس آسانی سے مسئلہ کی ایسی تشریح کر دی کہ اس کے بعد اس طرح کے سوالوں ”لو جی! اس میں چور کا کیا قصور ہے اس کی تقدیر میں ہی ایسا لکھا ہوا تھا، قاتل کا کیا قصور؟ اس کی تقدیر میں یہی لکھا ہوا تھا، زانی کو کیوں ملامت کرتے ہو، تقدیر کے خلاف کون کیا کر سکتا ہے؟ وغیرہ وغیرہ“ سے نجات مل جاتی ہے۔

اسی طرح اکثر اوقات ایسا ہوتا کہ سبق کے اختتام پر طلبہ اُستاد محترم سے فرمائش کرتے کہ اُستاد جی! لیلیٰ مجنون کے اشعار سنائیں، تو اُستاد محترم اپنے مخصوص لہجے میں پورے طرز سے لے میں آکر وہ اشعار سنا دیتے، ان اشعار کا اصل لُطف تو انہیں ہی آسکتا ہے جنہوں نے اُستاد محترم کی زبانی یہ اشعار سنے ہوں، لیکن دوسروں کے لیے بھی فائدے سے خالی نہیں، اس لیے کہ اُستاد محترم کا مقصود ان اشعار سے اللہ تعالیٰ کی محبت کی طرف اور اللہ تعالیٰ کی طرف

سے آنے والی مشکلات و تکالیف پر صبر کی طرف پھیرنا ہوتا تھا، ملاحظہ فرمائیں۔

سُنّا ہے لیلیٰ کا یہ دستور تھا  
 بھیک دیتی دَر پہ آتا جو گدا  
 اک دن مجنون بھی کاسہ ہاتھ لیے  
 آ پکارا، کچھ ہمیں بھی لُڈا! دے  
 آئی لیلیٰ، سبھیں کو کچھ دیا  
 ہاتھ سے مجنون کے کاسہ لے لیا  
 دے پُٹّ مارا زمیں پر ایک بار  
 رقص میں مجنون ہوا بے قرار  
 کسی نے پوچھا، اے مجنون خام!  
 رقص کا تھا، ایں جا کیا مقام؟  
 بولا مجنوں! تم میں کوئی عاشق نہیں  
 عاشقوں کی رمز سے واقف نہیں  
 کسی کے عاشق کے ہوئے ایسے نصیب؟  
 بلا نازل کرے جس پہ اُس کا حبیب

اسی طرح مطالبہ ہوتا کہ حضرت! ملا دو پیازہ اور برہل کے واقعات سنائیں تو  
 اُستادِ محترم رحمہ اللہ اُن کے واقعات سنا دیتے، تو پوری مجلس ایسے ہو جاتی، گویا پھلجڑیاں  
 پھوٹ پڑی ہوں، الغرض! اُستادِ محترم رحمہ اللہ کا سبق ہوتا یا بیان؛ شریک ہونے والا کسی  
 طرح بھی بُر نہ ہوتا تھا اور پوری طرح ہشاش بشاش اُس درس یا بیان سے مستفید ہوتا تھا،  
 اُستادِ محترم رحمہ اللہ کی خصوصیت یہ تھی کہ رات نمازِ عشاء کے بعد حیاۃ الصحابہ کی  
 تعلیم کروانی ہوتی یا صحیح البخاری کا سبق پڑھانا ہوتا، اُس کا مطالعہ ضرور کرتے تھے، حتیٰ کہ ایسا

بھی دیکھنے میں آیا کہ سبق کے لیے طلبہ کو مسجد میں جمع کیا گیا، لیکن پھر بعد میں یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ میں مطالعہ نہیں کر سکا، اسی طرح ایک بار آپ کی نمازِ عشاء کے بعد ”حیاء الصحابہ“ کی تعلیم کروانی طے ہوئی، لیکن کثیر مصروفیات کی بنا پر آپ مطالعہ نہ کر سکے تو فرمایا: کہ مولانا نذر الرحمن صاحب کو جا کر کہہ دو کہ آج میں مطالعہ نہیں کر سکا، آپ کروالیں۔

اسباق کی پابندی کا یہ عالم تھا، کبھی ناغہ نہ ہونے دیتے تھے، اگر کبھی کہیں کا سفر درپیش ہوتا تو جانے سے قبل یا واپسی پر جو بھی وقت ہوتا طلبہ کو بلوا لیتے اور سبق پڑھاتے، حتیٰ کہ دیکھا گیا کہ رات کے دو بجے اور اسی طرح تین یا چار بجے بھی سبق کے لیے طلبہ کو بلوا لیتے تھے۔ معمولی تھکاوٹ یا بیماری کی تو پروا ہی نہیں ہوتی تھی۔

الغرض! حضرت کی صفات، خصلتوں اور عادات و خصائص کا ذہن میں اس قدر جھوم ہے کہ اُس کے استحصا کے لیے شاید پوری کتاب بھی ناکافی ہو، لیکن فی الوقت اسی پر اکتفا کرتا ہوں کہ پہچاننے کے لیے پوری دیگ کو نہیں، چند دانوں کو ہی چکھا جاتا ہے، ضرورت ہے کہ اُن کے خصائل حمیدہ کو سامنے رکھا جائے، دعوت و تبلیغ علمی و عملی میدان اور تقویٰ والی زندگی میں ان کی اتباع کی جائے، اور موجود حیات بزرگانِ دین اور اساتذہ کرام کی قدر کرتے ہوئے اُن کے وجودِ مسعود کو غنیمت سمجھ کر اُن کی صحبت سے خوب استفادہ کیا جائے۔

اُستادِ محترم رحمہ اللہ نے ۱۹۲۸م میں اس دنیا میں آنکھ کھولی اور ۳/نومبر/۲۰۱۴م میں انتقال ہوا، اُستادِ محترم رحمہ اللہ زندگی کے چھبیس سال اس طرح گزار کے گئے ہیں کہ اُن پر فخر کیا جاسکتا ہے، یقیناً اللہ تعالیٰ بھی اُن سے راضی ہوں گے اور آخرت میں اُن کے ساتھ اعزاز و اکرام والا معاملہ فرمائیں گے، ان شاء اللہ العزیز

اُستادِ محترم کے پسمانگان میں صُلَی اولاد: دو بیٹیاں اور ایک بیٹا (ماشاء اللہ سب شادی شدہ اور صاحبِ اولاد ہیں) اور روحانی اولاد: لاکھوں فرزند ان شامل ہیں، جس طرح

اُستادِ محترم کی صلی اولاد تعزیت کی مستحق ہے، بالکل اسی طرح آپ کے لاکھوں روحانی فرزند ان بھی تعزیت کے مستحق ہیں، اللہ تعالیٰ ہم سب کو صبر جمیل اور حضرت کا نعم البدل نصیب فرمائے، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ اِنَّ لِلّٰہِ مَا اَخَذَ، وَلِلّٰہِ مَا اَعْطٰی، وَکُلُّ شَیْءٍ عِنْدَہٗ بِاَجَلٍ مُّسَمًّی اَعْظَمَ اللّٰہُ اُجْرَنَا، وَاَحْسَنَ اللّٰہُ عَزَاءَنَا، وَغَفَرَ لِمَیْتِنَا۔

اُستادِ محترم کے صاحبزادے حضرت مولانا عبید اللہ خورشید صاحب حفظہ اللہ علمی، عملی، تبلیغی اور روحانی لائن میں ماشاء اللہ ہو بہو اپنے والد صاحب کے قدم بقدم ہیں، اللہ تعالیٰ نے انہیں بھی خوب سے خوب اخلاق کریمہ اور خصائل حمیدہ سے نوازا ہے، آپ مجموعی طور پر طلبہ کرام اور اساتذہ کرام میں مقبول ترین شخصیت ہیں، طلبہ کرام کی ایک بڑی اکثریت فراغت کے بعد علمی، عملی، تدریسی و تبلیغی میدان میں آپ سے ہی مشاورت رکھتی ہے، اللہ تعالیٰ نے انہیں تدریسی لائن میں بھی خوب مہارت اور ملکہ عطا فرمایا ہے، مدرسہ عربیہ رائے ونڈ میں درجہ علیا تک کی کتب آپ کے زیر تدریس ہیں، اب تک درسِ نظامی کی تقریباً تمام اہم کتب کی تدریس کا تجربہ حاصل کر چکے ہیں، بندہ نے حضرت زید مجدہ سے ۲۰۰۷م میں تفسیر جلالین حصہ دوم پڑھی، ماشاء اللہ اندازِ تدریس اور حلِ کتاب اور متعلقہ مباحث پر سیر حاصل گفتگو کرنا آپ کا وصفِ ممتاز ہے، اللہم زد فزد، اللہ رب العزت آنجناب کا مبارک سایہ تادیر ہمارے سروں پر بعافیت رکھے اور جہاں اُن سے دین متین کی مبارک خدمات لے وہاں ہم ضعفاء کو بھی اُن کے علوم اور صلاحیتوں سے خوب سے خوب استفادہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے، نیز! اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ وہ اُستادِ محترم حضرت مولانا جمشید علی خان صاحب رحمہ اللہ کو اپنے مہمان خانے میں اعلیٰ مقام میں جگہ مرحمت فرمائے، نبی اکرم ﷺ کا پڑوس اور قرب نصیب فرمائے، اور ہم ضعفاء کو اُن کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین ثم آمین

ع۔ن۔ت

## تعارف کتب

نام کتاب: حکیم الامت کیا تھے؟ مرتب: صوفی محمد راشد زید مجدہم

ناشر: ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان صفحات: ۴۸

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانوی قدس سرہ اپنے دور کی یگانہ روزگار ہستی تھے، لاکھوں لوگ حضرت کی تعلیمات سے فیض یاب ہوئے اور فیض رسانی کا یہ سلسلہ حضرت رحمہ اللہ تعالیٰ کے ملفوظات و خطبات اور دیگر کتب کی صورت میں اب بھی جاری ہے۔ دوسری طرف حضرت کا سخت گیر ہونا بھی مشہور ہے۔

زیر نظر رسالہ جو دو مضامین کا مجموعہ ہے ”تجدید دین اور جامع المجہد دین“، ”حکیم الامت کے طریقہ اصلاح بطرز سیاست کی حقیقت“ اس میں حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے جامع المجہد دین ہونے اور سخت گیری کی حقیقت اور اس کی مصالحوں کا مکمل بیان کیا گیا ہے۔ رسالہ کے آخر میں حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے ملفوظات و مواعظ کے متعلق شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم کے تاثرات بھی درج کیے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مرتب زید مجدہم کو اس عظیم خدمت پر جزائے خیر عطا فرمائیں، آمین۔

نام کتاب: انوار درود شریف مرتب: صوفی محمد راشد زید مجدہم

ناشر: ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان صفحات: ۳۲

زیر نظر رسالہ میں درود شریف کے فضائل و برکات سے متعلق چہل حدیث اور درود شریف کے مستند الفاظ نقل کیے گئے ہیں جو روزمرہ کے معمولات میں شامل کرنے کا بہترین وظیفہ ہیں۔ اور چہل حدیث کی اشاعت پر بہت سے فضائل کتب احادیث میں منقول ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرتب زید مجدہم کو اس فضیلت سے سرفراز فرمائیں، آمین یا رب العالمین۔

مولانا محمد آصف چنیوٹی

## اخبار الجامعہ

۳/ محرم الحرام: معروف سابق پاکستانی کرکٹر جناب انضمام الحق صاحب جامعہ میں آئے اور عشاء کے بعد جامع مسجد حقانیہ میں بیان کیا۔

۶: حضرت مہتمم صاحب مدظلہم نے بعد عصر ہفتہ وار اصلاحی درس دیا۔

۱۰: حضرت مدظلہم نے علماء کرام کو یوم عاشورہ کی مناسبت سے مسلسل بیوم العاشور اور دیگر احادیث مسلسل کی اجازت دی۔ اس موقع پر حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرحمن کوثر المدنی مدظلہم نے بھی علماء کرام کو مسلسل بالاولیہ اور مسلسل بیوم العاشور کی اجازت دی۔

۱۱: حضرت مدظلہم نے مدرسہ امدادیہ فتحیہ سلانوالی میں ماہانہ اصلاحی درس دیا۔

۲۱: حضرت علامہ مولانا عبدالغفار تونسوی مدظلہم جامعہ میں تشریف لائے اور درجہ تخصص کے طلباء کو فرق باطلہ کے رد پر دروس دیے۔ ۲۶: مفتی محمد طیب صاحب مدظلہم مہتمم جامعہ امدادیہ فیصل آباد جامعہ میں تشریف لائے اور درجہ تخصص کے طلباء سے خطاب فرمایا۔ ۲۸: حضرت مدظلہم تین روزہ تبلیغی و اصلاحی دورہ پر پاکستان، اوکاڑہ، عارف والا، لاہور تشریف لے گئے، مختلف مقامات پر اصلاحی بیانات فرمائے۔

۲۸: محرم الحرام سے جامعہ درجہ کتب و تخصص کے طلباء کا تحریری امتحان شروع ہوا جو ۳ صفر المظفر تک جاری رہا۔ مورخہ ۴ صفر المظفر کو تمام درجات کا تقریری امتحان ہوا، دیگر علماء و قراء کے علاوہ درجہ کتب کے امتحان کے لیے حضرت الاستاذ مولانا صالح محمد مدظلہم اور حضرت مولانا قاری محمود صاحب مدظلہم خصوصی طور پر تشریف لائے اور طلبہ کی مجموعی کارکردگی پر اطمینان کا اظہار فرمایا۔

۶: حضرت مدظلہم شیخوپورہ تشریف لے گئے اور قرآن کریم حفظ کرنے والے بچے

کو آخری سبق پڑھایا اور بیان کے بعد واپسی ہوئی۔

۱۴: حضرت مدظلہم نے چک نمبر ۷۲ سرگودھا میں تکمیل حفظ قرآن کریم کی تقریب

سے خطاب فرمایا۔

۱۶: مدرسہ مدینۃ العلوم سرگودھا کے ناظم اعلیٰ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب

انتقال فرما گئے، اناللہ وانا الیہ راجعون۔ حضرت مہتمم صاحب مدظلہم نے عید گاہ

سرگودھا میں نماز جنازہ پڑھائی، جامعہ کے اساتذہ اور طلبہ نے بھی شرکت کی۔ اللہ تعالیٰ

حضرت مرحوم کی مغفرت فرمائیں اور ان کے درجات بلند فرمائیں۔

جامع مسجد ترمذی:

ساہیوال حقانیہ ٹاؤن فروکہ روڈ پر جامع مسجد ترمذی کے تہہ خانہ 94x76 کی چھت

کالٹر بچہ اللہ ڈال دیا گیا ہے۔ جس پر اب تک تقریباً ایک کروڑ روپیہ خرچ ہو چکا ہے جبکہ

ابھی مسجد کے ہال، برآمدے پہلی اور دوسری منزل کی تعمیر کا کام باقی ہے، جس کا تخمینہ

لاگت تقریباً ساڑھے تین کروڑ روپے ہے۔

تہہ خانہ کے فرش کا نصف کام بچہ اللہ مکمل ہو چکا ہے، قارئین سے سہولت کے

ساتھ تکمیل کے لیے دعا کی درخواست ہے۔